مجاہدین ہزارہ

داؤد کوثر

مجاہدینِ ہزارہ

داؤد ـــــ کوثر

ملنے کا پتہ:۔
نظیر دی ہٹی مانسہرہ (ہزارہ)

تاریخ اشاعت یکم جنوری سنہ ۱۹۸۰ء مطابق ۱۲ ربیع الاول سنہ ۱۴۰۰ھ

تعداد اشاعت :۔ ایک ہزار

ناشر :۔ شہزادہ عاشق الٰہی ایڈووکیٹ

طابع مصطفائی پریس ایبٹ آباد

ملنے کا پتہ :۔
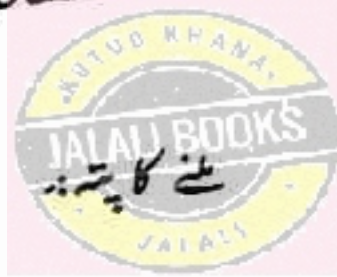
۱۔ نفیس اکیڈمی سٹریچن سٹریٹ کراچی نمبر ۱
۲۔ مکتبہ رشیدیہ لمیٹڈ ۳۴۔ اے شاہ عالم لاہور
۳۔ سٹیزن الیکٹرک سٹور اینڈ بک سیلرز کشمیر روڈ مانسہرہ ہزارہ
۴۔ نظیر دی ہٹی مانسہرہ ہزارہ

داؤد کوثر   مصنف
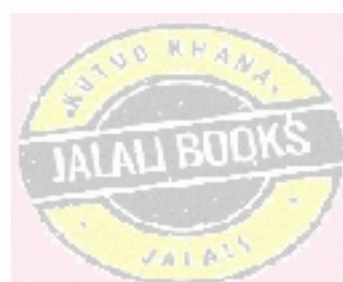
انتساب

ان شہدائے بالاکوٹ اور حریت پسندوں کے نام

جنہوں نے
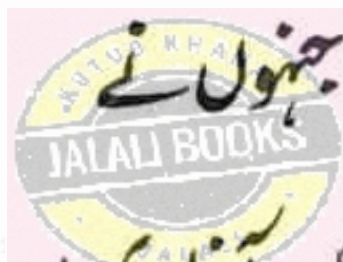
اپنی انمول جانیں تحریک آزادی اور بقائے اسلام

کیلئے

وقف کردیں

مرے خاک وخوں سے تونے یہ جہاں کیا ہے پیدا

صلۂ شہید کیا ہے؟ تب وتاب جاودانہ

(اقبالؒ)
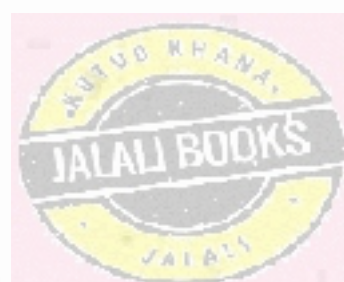
پیش لفظ

مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ اس امر کی متقاضی ہے کہ حق و باطل کی جنگ میں اسلاف کے کارنامے ان کے پیش نظر رہیں انہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ اس جنگ کی نوعیت کیا تھی؟ منافقوں کا عمل کیا تھا؟ اور دشمن کن حربوں سے لیس تھا؟ ایسی معلومات کے بغیر آئندہ جدو جہد کیلئے نہ ذہنی تیاری ممکن ہے اور نہ صحیح منصوبہ بندی کا کوئی عمل ہو سکتا ہے

داؤد کوثر مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے بڑی محنت سے مجاہدین کی تاریخ کی کڑیوں کو یکجا کیا ہے مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کے مطالعے سے نہ صرف بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائینگی جو فرنگی مؤرخوں نے پھیلا رکھی ہیں بلکہ پرجوش کردار کی تخلیق بھی ہو سکے گی جس کے بغیر ملت کے عروج کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

سید واجد رضوی

ایڈوکیٹ۔ ایبٹ آباد

زیر نظر کتاب میں آپ کو بطلِ حریت اور شمع آزادی کے وہ پروانے ملیں گے جنہوں نے راہِ حق میں اپنی جانیں کٹا کے شمع آزادی کو روشن کیا وہ شہداء آج بالاکوٹ کی سرزمین کو رونق بخشے ہوئے ہیں آزادی کے یہ پروانے ہمارے اسلاف کے انمول ہیرے ہیں۔

یہ اس کاروان کی داستان ہے جس کا خواب مصورِ پاکستان حضرت علامہ اقبالؒ نے دیکھا اور مفکرِ اسلام حضرت جمال الدینؒ افغانی نے اپنی زندگی کا طویل حصہ ان ہی آرزوؤں کی تکمیل اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کیلئے صرف کیا تھا۔

"مجاہدینِ ہزارہ" میں جناب داؤد کوثر صاحب نے ایسے عناصر کو بے نقاب کیا ہے جو ملتِ اسلامیہ کے ہر دور میں رِستا ہوا ناسور ثابت ہوئے اور اتحادِ اسلامی میں رخنہ کا موجب بنے لیکن ہر دور میں کئی جاں نثار رسمِ شبیری کا حق بھی ادا کرتے رہے میں کوثر صاحب کو اس لئے بھی قابلِ قدر سمجھتا ہوں کہ انہوں نے شمعِ رسالتؐ کے کئی پروانوں کا ذکر خوش اسلوبی سے کیا ہے۔

راجہ شیراز حسین کیانی

کیہال ایبٹ آباد ہزارہ

(۳)

قبل اس کے کہ "مجاہدین ہزارہ" کے معلوماتی پہلوؤں پر تبصرہ کروں ضروری سمجھتا ہوں کہ مصنف کے متعلق بھی اپنی حقیر رائے پیش کروں۔ داؤد کوثر کی شخصیت کسی تعریف کی محتاج نہیں وہ ایک نہایت ہی بلند پایہ مقرر اور انشاء پرداز ہیں مجھے صاحب موصوف سے بے پناہ قربت کے باعث ان کی اس گراں مایہ تخلیق پر خوشی اور فخر حاصل ہے ان کی زیر نظر تصنیف ایک قابل ستائش کاوش ہے اور اس کاوش کو پسندیدگی سے نہ دیکھنا ایک ستم ظریفی ہے "مجاہدین ھزارہ" ایک ایسی کتاب ہے جو پڑھنے کیلئے ناگزیر ہے گرامی قدر داؤد کوثر نے مرتب کر کے شہدائے بالاکوٹ کو خراج عقیدت پیش کیا ہے اس کے علاوہ تاریخ ان گمنام شخصیات سے بھی مزین ہے جنہوں نے عملی اور سیاسی سطح پر انمٹ نقوش چھوڑے ہیں اور ساتھ ہی تاریخ خلافت کے اہم پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے جو کہ اس سے پہلے کسی بھی نکتہ ور صاحب قلم کی نظر سے نہیں گزرے یہ سعی یقیناً کوثر صاحب کی مدتوں کی عرق ریزی کا نتیجہ ہے۔

زیر نظر کتاب کے اوراق سے صاف عیاں ہے کہ حضرت سید احمد شہیدؒ کے قدم مبارک جن راستوں سے گزرے بالآخر وہی نقشۂ پاکستان کے قیام پر منتج ہوا اس سے بڑھ کر شاہ صاحب کا اعجاز کیا ہو سکتا ہے؟ درحقیقت ــــــ مجاہدین ہزارہ ــــــ دلکش اور جامع انداز میں ــــــ "کاروانِ آزادی" ــــــ کی انمول سرگذشت ہے۔

اپنی حقیر رائے اور چند الفاظ کے ساتھ اپنا تبصرہ اس بات پر ختم کرتا ہوں کہ جس جذبے اور جانفشانی کے ساتھ مصنّف نے اس کتاب کے ہر صفحے میں نئی روح پھونکی ہے میرا ایمان اور قوی یقین ہے کہ شہدائے بالاکوٹ کے مقدس خون کی طرح یہ کتاب لافانی شہرت کی حامل ہو گی اور تحریک آزادی کے پروانوں کی طرح شہرتِ دوام حاصل کرے گی میری نیک تمنائیں اور جذبات بہرحال مصنّف کے ساتھ ہیں

ع

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ!

طارق محمود ذکی

مانسہرہ۔ ہزارہ
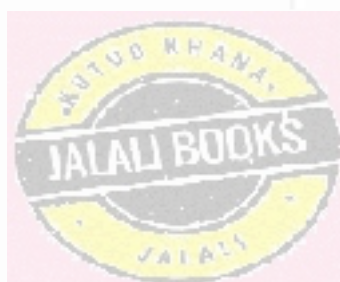
زیر نظر کتاب "کاروانِ آزادی" کی انمول سرگذشت ہے شہدائے بالاکوٹ
اور مجاہدین آزادی حضرت شیخ سرہندؒ کے فرمودات پر عمل پیرا تھے لہٰذا نظریہ پاکستان
کے ابتدائی خدوخال کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے درحقیقت حضرت مجدّد
الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کو اودے رام نامی ایک شخص نے دو خط لکھے اودے رام
چونکہ صوفیائے کرام کا انتہائی عقیدت مند تھا اسی نظریہ کے تحت اس نے حضرت مجدد
رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا کہ

"دنیا میں صلح و آشتی ہونی چاہیئے اور میرے خیال میں رام اور رحیم ایک
ہی ہیں"

حضرت مجدّدؒ نے اپنے مکتوب میں لکھا کہ

"خالق مخلوق میں پیوست نہیں ہوتا اور چوں و بے چوں سے متحد نہیں ہو
سکتا تمہارا نظریہ گمراہی پر مبنی ہے اور رام و رحیم کی یک جائی کا خیال
سب سے بڑی ضلالت ہے حضرت مجدّدؒ نے فرمایا

عیسیٰؑ بدین خود، موسیٰؑ بدین خود، لکم دینکم ولی دین

مسلم اور غیر مسلم میں اس قسم کی رواداری کا کوئی ملغوبہ پروان نہیں چڑھ سکتا البتہ اچھی
ہمسائیگی کے لوازمات بروئے کار لائے جا سکتے ہیں پس یہ تھی خشتِ اول نظریۂ پاکستان
کی، اور دنیا نے دیکھ لیا کہ مومنانہ بصیرت نے تین سو سال پہلے قرطاس پر جو لفظی نقشہ
کھینچا تھا تین سو سال بعد "پاکستان" کی صورت میں عملی شکل اختیار کر لی، پاکستان کی

تحریک نے اس عرصہ میں مختلف منازل طے کرلیے اس تحریک کو کبھی مرہٹوں کا مقابلہ کرنا پڑا اور کبھی سکھوں کا اور آخر میں سب سے طاقتور دشمن سے اسے مقابلہ کرنا پڑا اس لئے انگریز نے چونکہ مسلمانوں سے حکومت لی تھی وہ نہیں چاہتا تھا کہ برصغیر میں پھر کبھی بھی مسلمان سر اٹھا سکے اس مقصد کے حصول کیلئے اس نے ہندو کو تیار کرکے آگے بڑھایا اور مختلف حیلوں بہانوں سے اور الزامات کے تحت مسلمان کے منقولہ اور غیر منقولہ تمام اثاثے دولت و ثروت اور اقتدار کے ذرائع تباہ کرکے معاشی طور پر مسلمان کو ہندو کے تابع کر دیا اس کا نتیجہ ہندو کی برتری اور مسلمان کی ذلت و پستی میں ظاہر ہوا اور نتیجتاً اہل دل مسلمان اس نئی صورت حالات پر سوچ و بچار کیلئے مجبور ہو گئے۔

مقام مسرت ہے کہ داؤد کوثر نے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ اسلامیان ہند کی ہزار سالہ جد و جہد سے عیاں ہے کہ یہ رام اور رحیم کے چاہنے والوں کے مابین شدید کشمکش تھی، بالآخر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان معرض وجود میں آیا مصنّف کی سعی لائق ستائش ہے کہ ادب کے اس شعبے میں انہوں نے ایک دلچسپ اور قیمتی باب کا اضافہ کیا ہے

عبدالغفور ملک

ایبٹ آباد، ہزارہ

حرفِ آغاز

عروسِ آزادی کے بناؤ سنگھار، مشاطہ گری تحریکِ خلافت سے لیکر تحریکِ پاکستان تک فکری آبیاری اور عملی اعانت میں جو حصہ اس بنجر زمین ہزارہ کا ہے برصغیر کا کوئی دوسرا علاقہ شاید ہی اس کی ہمسری کا دعویدار ہو، مانا کہ ہزارہ ایک دور افتادہ پس ماندہ گوشۂ وطن ہے جہاں نہ کوئی ڈھنگ کی درس گاہ ہے نہ فیکٹری نہ ریڈیو اسٹیشن۔ ہوائی اڈہ اور ریلوے لائن کا تو ذکر ہی کیا؟ بیشتر آبادی غربت وافلاس جہالت بیروزگاری اور بیماری کا شکار خانوادوں کے رحم وکرم پر قسمت کو رو رہی ہے

ع اے روشنیٔ طبع تو بر من بلا شدی

حسنِ فطرت کی سحر کاریوں نے مقامی لوگوں پر کچھ اور بھی قیامت ڈھائی ہے قابلِ کاشت زمین کے قابلِ ذکر قطعات زمین ہیں تو اطراف واکناف وطن بوالہوس حسن پرست امراءُ و رؤسا کی پرشکوہ کوٹھیوں اور عالیشان شبستانوں کی نذر ہو گئے ہیں۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ برصغیر سے پاسبان ملے تو اسی بنجر زمینِ ہزارہ سے

ہزارہ برصغیر میں مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ کا امین ہے۔ ہزارہ! مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ اور شوکتِ گم گشتہ کے جویا دیکھ! تیری دھرتی کے سپوتوں نے تیرے سینے کو اپنے خون سے لالہ زار کر دیا۔ "تحریک ریشمی رومال" اور "تحریک خلافت" کے یکتائے روزگار مولانا محمد اسحٰق اور مولانا ابو المعارف محمد عرفان تیری گھاٹیوں سے اٹھے ہیں۔ کون کہتا ہے کہ تیری کوکھ بانجھ ہے؟ تیری فرحت بخش ہوا تیرے ٹھنڈے پانیوں اور تیری ابھرتی پھیلتی گھاٹیوں نے ان نادرِ روزگار ہستیوں کو جنم دیا تھا جو مشعل بکف "اسلامی ریاست" کے قیام کیلئے نکلے۔ آگ اور خون کی ندیوں میں

فرنگی راج کی جبر و استیلاء کی ناقابلِ فراموش یادگاریں لئے آگے بڑھے اور منزل منزل دیپ جلائے۔ عروسِ آزادی کی خاطر اپنی جانیں نچھاور کر گئے۔ جن کے نقوشِ پا سے غلامی کی لعنت سے چھٹکارا پانے والی ہر قوم درسِ آزادی لے سکتی ہے۔ غلام اقوام کی صف میں بھارتی استبداد میں جکڑے ہوئے مظلوم کاشمیری ہوں، فلسطین، قبرص، اری ٹیریا اور روڈیشیا کے مظلوم مسلمان، مجاہدین کے جذبۂ حریت کو سرزمینِ ہزارہ ہمیشہ ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتے رہیں گے۔

کفر و باطل کے معرکوں میں روحِ اسلام جاری و ساری رکھنے اور اسلامی تہذیب و فکر اور تمدن کے احیاء اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کیلئے ہمیں کسی قسم کے ایثار و قربانی سے گریزپا نہیں ہونا چاہیئے۔ اور ان راہوں میں زیست کو وقف کرنا اور داؤ پر لگانا ایک سچے مسلمان کی طرح باعثِ نجات سمجھنا چاہیئے۔ طاغوتی قوتیں کتنی قوی اور مضبوط ہی کیوں نہ ہوں روحانیت، بھلائی اور خیر کا وہ ازلی اور ابدی سرچشمہ ہے جس کے فیض سے ہم دنیا کی بڑی سے بڑی قوت سے بلاخطر ٹکر لے سکتے ہیں۔

داؤد کوثر

حدو بانڈی۔ مانسہرہ۔ ہزارہ

ہنجر آباد اور تحریکِ مجاہدین

اس "ہنجر آباد" سرزمین کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ اس نے یونانیوں کے عزم و ہمت کا نظارہ کیا اور گیانیوں کی امن و آشتی کے پیغامات سنے۔ مغلوں کی سطوت و شوکت کے نقوش پڑھے۔ ترکوں اور ہزارہ کی جری اقوام کی معرکہ آرائیوں کے خونیں مناظر دیکھے۔ سکھوں کی وحشت و بربریت پر آنسو بہائے اور انگریزوں کی رسوائے زمانہ پالیسی کے اسرار و رموز سے آگاہی حاصل کی۔

برصغیر ہند و پاک کے مسلمان ایک سو نوے سال غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رہے یہ زنجیریں آخری مغل تاجدار کے "نمک خوار" غداروں کے ہاتھوں پہننی پڑیں جنہوں نے دولت کے لالچ میں مذہب و ملت کو قربان کر دیا۔ ہندوستان جس پر صدیوں سے مسلمانوں کی حکومت تھی ایک خونیں انقلاب کے بعد فرنگیوں کے ہاتھوں میں چلا گیا اور وہ قوم جس نے صدیوں تک ہندوستان پر حکومت کی تھی حکمرانوں سے غلام بن کر رہ گئی۔ بابر و جہانگیر، شاہجہان و عالمگیر کی اولاد کو ہاتھیوں کے پاؤں تلے روندا گیا۔ مغل خاندان کی عصمت مآب بیبیوں کی عزت و ناموس کو فرنگیوں نے پاؤں تلے کچل ڈالا اور یہ سب کچھ ملک و ملت کے غداروں کی زرپرستی کا نتیجہ تھا۔

خالقِ کائنات گمراہی کے اندھیروں میں بھٹکے ہوئے مسلمانوں کو ایک سبق دینا چاہتا تھا۔ اس نے ریاست میسور میں فرنگی نواز غدار پیدا کئے۔ سلطان ٹیپو رح آخری دم تک کہتا رہا

"شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے"

اس کی شہادت میں ریاست کے غداروں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بنگال میں

میر جعفر جیسے غدار پیدا ہوئے جن کی ملت فروشی سے سراج الدولہ قتل ہوئے۔

برصغیر پاک و ہند میں انیسویں صدی سے پہلے جتنی تحریکیں اٹھیں ان کا مقصد اصلاح حکومت تھا۔ کیونکہ اس وقت حکومت خود مسلمانوں کی تھی۔ انیسویں صدی کی ابتدا سے ہند و پاک کی سیاسی نوعیت بدل گئی۔ ۱۸۰۳ء میں "ایسٹ انڈیا کمپنی" نے ملک کے اکثر و بیشتر حصوں پر تسلط حاصل کر لیا تھا۔ مدراس، بنگال، میسور، دکن روہیل کھنڈ اور یو۔پی کے صوبجات پر ایسی حکومت تھی جو کمپنی کی معاون و مددگار تھی۔ اور ان کے ساتھ کمپنی کے معاہدے تھے۔ ان حالات میں خاندانِ ولی اللہؒ کے چشم و چراغ حضرت مولینا شاہ عبدالعزیزؒ اور ان کے رفقاء کی جماعت نے ملکی اور بین الاقوامی حالات پر غور و خوض کرنے کے بعد آزادئ وطن کی سب سے پہلی تحریک کی ابتداء کی۔ جس کا مدعا یہ تھا کہ ہندوستان میں رہ کر مقابلہ کرنا ناممکن تھا۔ لہٰذا محاذ جنگ شمال مغربی صوبہ سرحد بنایا گیا۔ اور اندرون ہند سے مالی اور فوجی سلسلے کی ترسیل براستہ سندھ، کوئٹہ بلوچستان متعین کی گئی۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے ہندوستان کے "دارالحرب" ہونے کا فتوےٰ دیا اور رفقاء کو ملک کے مختلف اطراف و اکناف میں تبلیغ جہاد پر مامور کیا۔ آپ کے جانشین آپ کے شاگرد خلیفہ سید احمد شہیدؒ مقرر ہوئے۔

آپ کا مقصد یہ تھا۔ کہ سکھوں کی حکومت کا روڑا راستے سے ہٹا کر پورے ہندوستان سے ظالم حکومت کو نکال کر ملک بھر کو آزاد کیا جائے۔ اس تحریک کا مقصد و مدعا حصول آزادی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اور وہ اس کیلئے کسی مادی یا دنیوی فائدے کے کبھی طلبگار نہ ہوئے۔ اور ان کے دلوں میں کلمۂ تحسین کی آرزو کا خیال بھی جاگزیں نہ ہوا۔ وہ بے سرو سامانی کے عالم میں اللہ کا نام لے کر اٹھے اور عزیمت و استقامت کے اعجاز سے وہ تحریک پیدا کی جس کی آگ کے شعلوں نے

شاہ صاحب نے اس تحریک کو بطریق احسن صوبہ سرحد میں مسلسل چھ سال تک چلایا

سکھوں اور ایک سو سال تک انگریزوں کی قاہرانہ قوت کو مسلسل آتش زیر پا رکھا۔ آج ہم کیسے اندازہ کرسکتے ہیں کہ ان لوگوں کے دلوں میں کیسی تڑپ تھی اور ان کا مطمع نظر کتنا بلند اور ارفع نصب العین تھا۔ ان کی عظمت کا اندازہ ہم کبھی نہیں کر سکتے۔ جو فرض اور تسلیم و رضا کے صحیح مفہوم سے بھی ناآشنا ہیں۔ تاریخ کے اوراق بتلا رہے ہیں کہ سید صاحب اور ان کے رفقاء کو نہایت غیر معمولی اور ناسازگار حالات سے واسطہ پڑا۔ ایک طرف سکھ اور انگریز تھے جن کے سیاسی مقاصد یہ تھے۔ کہ "تحریک اسلامی" کے اصلی کارنامے منظرِ عام پر نہ آنے پائیں۔ انہوں نے اس عالمگیر تحریک کو گزند پہنچانے کیلئے بے پناہ پراپیگنڈہ کیا۔ دوسری طرف مقامی رؤسا اور خوانین تھے جن کے ذاتی و انفرادی مقاصد ان پاکیزہ فطرت مجاہدین کو زیادہ سے زیادہ دق کرنے میں ہمہ تن مصروف عمل رہے۔ سب سے آخر میں "مدعیانِ شریعت و طریقت" کا مقدس گروہ تھا جو بعض مذہبی نقطہ نگاہ سے ان افراد پر انتقام کی بجلیاں گراتا رہا۔ ان میں بعض حضرات نیک نیت بھی ہونگے تاہم وہ غلط فہمی کا شکار ہوئے بعض کی مخالفانہ سرگرمیوں میں اغیار کی تحریک کے شواہد نظر آتے ہیں۔ اس کے باوجود اسے سید صاحب اور ان کی جماعت کے خلوص کا اعجاز سمجھنا چاہیئے۔ کہ بعد کی تحریک ہائے آزادی اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

ابتدا میں جب سید احمد شہیدؒ نے مسلمانوں کو بغرض جہاد منظم کرنے کا قصد فرمایا تو پیروں کے شیوے کے مطابق مختلف علاقوں کے دورے کئے۔ جگہ بہ جگہ وعظ بھی ہوتے بیعت بھی لی جاتی "توجہ" بھی دی جاتی تھی۔ اس طریقے سے حسب منشا نتیجے برآمد ہونے کی توقع نہ کی جاسکتی تھی۔ تاہم ایک بہت بڑا فائدہ یہ تھا کہ انقلابی مساعی کے ساتھ ساتھ عوام کی صحیح تربیت کا کام بھی انجام پا رہا تھا۔

سید احمد شہیدؒ حکومت الٰہیہ کے قیام، مسلمانوں کی سربلندی اور ہندوستانی

کی آزادی کیلئے کوشاں تھے۔ اس کام کی تکمیل کیلئے انہوں نے ان علاقوں کو مناسب سمجھا جو انگریزوں کے دست بُرد سے باہر یا دور افتادہ ہوں۔ جہاں سے حکومت وقت کو بروقت ان کی سرگرمیوں کا اندازہ نہ ہو سکے۔ اور سکھوں کے تسلط سے تھوڑا سا علاقہ آزاد کرا کے چھوٹی سی خود مختار ریاست قائم کی جائے۔ تاکہ اپنے اصل مقاصد کیلئے جدوجہد جاری رکھی جائے۔ اس مقصد کی خاطر سید احمد شہیدؒ مجاہدین کے ہمراہ اپنی منزل کی طرف چل پڑے۔ جنہیں اپنے مقصد سے والہانہ لگاؤ کے باعث تائید ایزدی کا مکمل یقین تھا۔ اور یہی ان کا زادِ سفر تھا۔ یہ لوگ محض خدا کے نام پر کوہساروں اور میدانوں کی وسعتیں ناپتے ہوئے صوبہ سرحد آپہنچے۔ پشاور پہنچ کر انہوں نے فیصلہ کیا کہ وقت کی مناسبت سے بارک زئی اقتدار کا خاتمہ کر دیا جائے۔ چنانچہ لشکر کو ساتھ لے کر چل پڑے۔ چارسدہ سے تنگی اور شبقدر ہوتے ہوئے یخنی کے راستے وڈپگی (پشاور) پہنچے۔ تو پتہ چلا کہ ان کی آمد کی خبر سن کر سلطان محمد خان بارک زئی کی طرف سے ارباب فیض اللہ خان ساکن ہزار خوانی پشاور نے وکالت کرتے ہوئے صلح کیلئے سلسلہ جنبانی کی۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ سید صاحب معہ اپنے رفقاء کے بطور مہمان کابلی دروازہ سے پشاور شہر میں داخل ہو کر گور گٹھڑی میں مقیم ہوئے۔ ارباب فیض اللہ خان نے شرائط صلح طے کیں۔ فیصلہ یہ ہوا کہ حکومت سلطان محمد خان کو سونپ دی جائے جو بوقت ضرورت سید صاحب کی امداد کرتا رہے۔ اور بری عادتیں چھوڑ دے گا۔ پشاور میں اجرائے شریعت کیلئے قاضی مقرر کر کے سید صاحب واپس پنجتار پہنچے۔

سلطان محمد خان کو جب مجاہدین کی طرف سے اطمینان ہو گیا اور پشاور کا علاقہ اسے واپس مل گیا یا یوں کہیئے جس سلطنت کے لٹ جانے کا ڈر تھا وہ محفوظ ہو گئی تو اس نے سازشوں کے جال بچھانے شروع کر دیئے۔ اکثر مقامات کے خوانین و

صاحب اثر و رسوخ لوگ خوفزدہ ہو کر وقتی طور پر مجاہدین کے ہمنوا بن گئے۔ لیکن صدیوں کے اطوار کو ایک ہی وار میں کب دور کیا جا سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ "لوہے کو لوہا کاٹتا ہے" کے مصداق سلطان محمد خاں نے بھی علماء کی خدمات حاصل کیں۔ انہوں نے سید صاحبؒ اور ان کی جماعت کے خلاف فتوے دیئے۔ مخالفین کو ان فتووں کی آڑ مل گئی۔ بالآخر طے پایا کہ موقع پا کر مجاہدین کو شہید کر دیا جائے۔ اس کی ابتداء پشاور سے ہوئی۔ جہاں سلطان محمد خاں نے ارباب فیض اللہ خان اور سید صاحب کے مقرر کردہ قاضی و تحصیلدار کو قتل کیا۔ اور باقیوں کو بھی مختلف مقامات پر نہایت بیدردی سے قتل کر دیا گیا۔ اور یہ بزدلی اور بدعہدی کا ایسا واقعہ ہے۔ جس کا دھبہ پٹھانوں کے دامن سے دُھل نہیں سکتا۔

سید صاحبؒ پنجتار میں مقیم تھے یہ سن کر بہت مایوس ہوئے اور اس علاقہ کو چھوڑ جانے کا فیصلہ کیا۔ پائندہ خان اور ان خوانین کو جو اس سازش میں شریک نہ تھے بلا کر حقیقت حال دریافت کی۔ بعض مجرمین نے سید صاحبؒ کے مقرر کردہ افسران کی سختیوں کا ذکر کیا۔ بعض نے کہا کہ ہماری لڑکیوں کے نکاح ہماری اجازت کے بغیر کرائے جاتے ہیں۔ اور بعض نے کہا کہ سلطان محمد خاں کی طرف سے "ہندوستانی علماء" کے فتوے انہیں ملے تھے۔ جن میں مجاہدین کو انگریزوں کا جاسوس ظاہر کیا گیا تھا اور بتایا گیا تھا کہ وہ اس ملک کو انگریزوں کے حوالہ کر دیں گے۔ غرض ہر ایک نے کوئی نہ کوئی حیلہ تلاش کر لیا۔ حالانکہ یہ سب سلطان محمد خاں کا جذبۂ انتقام تھا۔

سید صاحبؒ کے خیالات سن کر بعض نے اختلاف کیا۔ لیکن جب سید صاحبؒ نے اس علاقہ سے انتہائی نفرت کا اظہار کر دیا تو سب خاموش ہو گئے۔ اس دوران باشندگان سوات سے بھی مذہبی اختلافات زور پکڑ گئے۔ ان حالات میں سید صاحبؒ نے صاف کہہ دیا کہ وہ میدانی علاقہ کی مخالفت دیکھ چکے ہیں۔ پشت پر سوات کا علاقہ

مخالف اور فتح خان پنجتار پر بھی انہیں اب بھروسہ نہیں رہا۔

ان حالات میں سید صاحبؒ نے پکھلی (ہزارہ) جانے کا فیصلہ کیا۔ اور وسط رجب ۱۲۴۶ھ میں خدا کا نام لے کر روانہ ہو گئے۔ کچھ عرصہ ہزارہ میں تبلیغ کرتے رہے۔ بالآخر بالاکوٹ ہزارہ میں سکھوں کے نرغے میں پھنس کر مردانہ وار جنگ کرتے ہوئے بروز جمعہ ۲۴ر ذیقعد ۱۲۴۶ھ مطابق ۶ر مئی ۱۸۳۱ء اپنے خلیفۂ نائب یا دستِ راست مولینا محمد اسمٰعیلؒ اور کئی دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ جامِ شہادت نوش کر گئے۔

۵

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

تحریک مجاہدین پر سرسری نظر سے ظاہر ہے کہ حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء کی تگ و دو، مسافرت کی صعوبتیں حتیٰ کہ اپنے وطن اجداد کو ترک کرنے کی غرض و غایت اعلائے کلمۃ الحق کا اجراز تھا۔ ہندوستان کو غیر مسلموں کی غلامی سے نجات دلانا تھا۔ صوبہ سرحد اور پنجاب کو سکھوں کے ناپاک قدموں سے پاک کرنا تھا اور اس مقصد اور ولولۂ خدمت اسلام نے انہیں ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے سرحد کی پہاڑیوں اور ہزارہ کی "وادئ گل پوش" تک پہنچایا۔ ابتداء میں انہیں اپنے مقصد میں کامیابی بھی ہوئی۔ علاقے کے باشندے جوق در جوق ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے لگے۔ ہر شخص ان کے اشارے پر اپنی جان و مال کی قربانی کرنے کو ہمہ تن تیار دکھائی دیتا تھا۔

یہ آزادئ وطن کیلئے سب سے پہلی اسلامی تحریک تھی جو دہلی کے

راہگذاروں سے اٹھی اور بالاکوٹ پہنچ کرنئے دور سے منسوب ہوئی۔ جس نے فکر وعمل اور اجتماعی نظام کو بدلنے کی بے پایاں کوشش کی۔ اس تحریک نے قوم میں جہاد کی روح پھونک دی۔ مسلمانوں کو دوبارہ اس جذبہ سے سرشار کیا کہ خدا کے دین کو غالب کرنے کیلئے وہ اپنی جانیں تک دے ڈالیں۔ پھر جن مشکلات سے یہ لوگ گزرے اور جس صبر وتحمل اور پامردی وہمت کا انہوں نے مظاہرہ کیا۔ اس کی نظیر ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ذاتی کردار اور راستبازی کا معیار اتنا بلند تھا کہ ہزاروں کا لشکر ایک بستی یا شہر میں وارد ہوتا ہے۔ اور کسی شخص کا ایک برتن تک نہیں ٹوٹتا۔ نہ ہی کسی دکان سے ایک چیز بھی اٹھائی جاتی ہے اور نہ بلامعاوضہ وقیمت لی جاتی ہے۔ مستورات ان کی پاکبازی کی شہادت دیتی ہیں۔ کہ "سید بادشاہ" کی فوج نہ معلوم کیسے انسانوں کی بنی ہوئی ہے۔ کہ کبھی ہم نے ان کی نگاہوں کو اٹھتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اس دور میں صحابہؓ کی مماثلت کی ہمیں کوئی مثال ملتی ہے تو اس تحریک میں وہی جذبہ، وہی تڑپ، وہی اخلاص وہی کردار وایثار اور وہی کیفیت کہ ہر شخص اپنے امیر پہ فدا ہو رہا ہے۔ اگرچہ اپنوں کی غداری اور چند وجوہ کے باعث یہ تحریک بظاہر کامیاب نہ ہو سکی۔ لیکن ہمیشہ کیلئے یہ ثابت کر گئی۔ کہ اگر اخلاص کے ساتھ خدا کے دین کو قائم کرنے کیلئے لوگ اٹھیں تو وہ اخلاق اور سیرت کردار کا ایسا نمونہ پیش کر سکتے ہیں۔ جن میں حضورؐ کے صحابہ کرامؓ کی زندگیوں کی یک گونہ مشابہت آجائے۔ بعض افراد کا خیال ہے کہ حضورؐ کے صحابیؓ مافوق البشر تھے۔ اب اس کے بعد یہ ناممکن ہے۔ "تحریک مجاہدین" کا مطالعہ کیجئے تو آپ تسلیم کریں گے۔ کہ اسلام وہ پارس ہے جس زمانے میں بھی انسانوں کو چھو جائے انہیں سونا بنا دیتا ہے۔ بشرطیکہ ان میں اخلاص ہو۔ اور وہ فکر وعمل سے اسلام کے آگے جھک جائیں۔

جنگ بالاکوٹ کے وقت مجاہدین کی اچھی خاصی تعداد حضرت سید احمدؒ اور مولینا محمد اسمٰعیلؒ کے ہمراہ تھی۔ اس کے علاوہ مجاہدین کے گروہ مختلف اطراف میں بکھرے ہوئے تھے۔ ایک جمعیت مولنا خیرالدین شیرکوٹی کی سرکردگی میں مظفرآباد کی مہم پر گیا ہوا تھا۔ یہ لوگ مصروفیات کے باعث جنگ کے موقع پر نہ پہنچ سکے۔ اس طرح تیس بتیس مجاہدین نصیرالدین منگلوری کی سالاری میں درہ بھوگرمنگ کی حفاظت پر مامور تھے۔ اور بعض مجاہدین کو جنگی نقطۂ نظر سے سید احمدؒ صاحب نے سیتھوں (موجودہ سیتھم) میں بٹھا دیا تھا۔ بالاکوٹ کے دلخراش سانحہ کے بعد یہ سب اکٹھے ہوئے تو ان کی تعداد سات سو کے قریب تھی۔ سب پر پریشانی کی کیفیت طاری تھی۔ وہ غم و اندوہ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کہ امیرالمجاہدین نہ تھا جو ان کی رہنمائی کرے یہی سب سے اہم مسئلہ تھا۔ کہ جماعتی تنظیم کو کیونکر برقرار رکھا جائے۔ اور کس کے زیرِ قیادت تحریک اسلامی کا از سر نو آغاز کیا جائے۔ ہر ایک کی نگاہ بار بار شیخ ولی محمد پر پڑی۔ اکابرین میں سے شیخ حسن علی، مولوی محمد قاسم پانی پتی اور مولوی نصرالدین منگلوری نے شیخ ولی محمد کو سمجھایا۔ کہ جماعتی نظام سے بے پرواہی اور بے تعلقی سراسر مصلحت کے خلاف ہے۔ کہ سب مجاہدین مایوس ہو کر اپنے گھروں کی راہ لیں گے۔ صرف ہم چند افراد رہ جائیں گے۔ پھر سعیٔ بسیار کے باوجود ہمارے مقاصد بھی پورے نہ ہو سکیں گے۔ موزوں صورت یہی ہے کہ مجاہدین کو تسلی دیجئے اور امامت کا بارِ گراں قبول کیجئے تاکہ نظام درہم برہم نہ ہو۔ اور ہماری انقلابی جد وجہد جاری رہے۔ مجاہدین کی اکثریت شیخ صاحب کی امارت پر متفق تھی۔ تینوں مشیروں کے اصرار پر صاحب موصوف امارت کی گراں ذمہ داریاں اٹھانے کیلئے تیار ہو گئے۔ تو سرکردہ حضرات

کے مشورے اور اتفاق سے باقاعدہ انتظام کیا گیا۔ اور مجاہدین ستھانہ کے قرب و جوار میں سکونت پذیر ہوئے۔ اور دین حق کی تبلیغ میں کوشاں رہے۔ کوہانہ کے قیام کے دوران ستمبر ۱۸۳۱ء میں علاقہ پکھلی کے مشہور شہر بفہ (BAFFA) پر شبخون مارا۔ جس میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔ دس مہینے کے بعد مجاہدین کو رخصت ہونا پڑا۔ اس سے پیشتر شیخ ولی محمد پنجتار گئے۔ وہاں سے سوات، بونیر پھر تختہ بند اور رناواگئی ہوتے ہوئے ایک سال کے بعد مجاہدین پھر پنجتار میں وارد ہوئے۔ جس کی سرزمین کا چپہ چپہ چار سال تک مجاہدین کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا مرکز رہا۔ لیکن اب ان کی حالت وہ نہ تھی جس میں وہ پنجتار سے رخصت ہوئے تھے۔ حضرت سید احمدؒ، مولینا اسمٰعیلؒ اور دوسرے اکابر راہِ حق میں شہادت پا چکے تھے۔ اگرچہ ان کے بلند مقاصد اور جذبۂ فداکاری میں کوئی فرق نہ آیا۔ تاہم ان کی سابقہ شان باقی نہ رہی تھی۔ مجاہدین ستھانہ میں ٹھہرے۔ وہاں سے دس مہینے کے بعد انہیں نکلنا پڑا۔ پنجتار میں ان کیلئے قیام غیر ممکن ہو گیا۔

اب پائندہ خان والیٔ ریاست تناول و امب ان کا رفیق بن گیا۔ لیکن اس سے بھی نہ نبھ سکی۔ آخر انہیں ستھانہ میں اقامت کرنی پڑی۔ اس پریشانی کا سبب یہ ہے کہ سادات ستھانہ کے سوا اکثر خوانین و رؤسا اور بااثر حضرات صرف نمود و نمائش کے پرستار تھے۔ جہاد فی سبیل اللہ کے لئے ان کے دلوں میں کوئی مخلصانہ جذبہ موجود نہ تھا مجاہدین کی قوت جانبازی سے وہ ذاتی فائدے اٹھانے کیلئے مصروف عمل تھے۔ انہیں مجاہدین کے گزر اوقات کا معمولی انتظام ناقابل برداشت معلوم ہوتا تھا۔ مجاہدین رضائے الٰہی کی خاطر ہر پیشکش کو قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے جب حقیقی مقاصد کیلئے مخلصانہ کام میں اعانت سے کامل مایوسی ہو جاتی تو انہیں اس کے سوا چارہ نہ

رہتا تھا۔ کہ دوسرا مقام تلاش کریں۔ صرف ستھانہ، چملہ اور بونیر کے سادات کا دامن غرض پرستی سے پاک رہا یہی وجہ ہے کہ ان کے سوا مجاہدین کی حقیقی اعانت اور رفاقت کا حق کوئی بھی ادا نہ کرسکا۔ جب مجاہدین پنجتار میں مقیم تھے تو پائندہ خان والئی امب کی طرف سے پیغام آیا۔ کہ میں سید احمدؒ کے زمانے میں آپ کی خدمتگزاری کی سعادت سے محروم رہا۔ آپ لوگ پنجتار سے امب چلے آئیں۔ شاید آپکی خدمتگزاری سے اللہ تعالیٰ میری سابقہ خطائیں اور لغزشیں معاف کر دے۔ چنانچہ شیخ صاحب مجاہدین کے ہمراہ ناواگئی پہنچے۔ دس گیارہ مجاہد اپنے ساتھ رکھ لئے باقی جماعت کو مولوی نصیرالدین کی سرکردگی میں امب بھیج دیا۔ پائندہ خان نے اس آمد سے پیشتر ایک وفد کے روبرو مولوی صاحب کے ہاتھ پر باقاعدہ بیعت کی۔ اور فسق وفجور سے تائب ہو کر اطاعتِ شریعت کا اقرار کیا۔ اسی وفد کے ارکان کو علاقہ اگرور اور جسی کوٹ کی حوالگی کا عہد نامہ لکھ کر دیا۔ یہاں یہ امر قابل غور ہے۔ کہ پائندہ خان علاقہ اگرور کو مجاہدین کے حوالے کر دینے پر آمادہ کیوں ہوا؟ اور کیوں اس نے بہ اصرار انہیں اپنے پاس بلایا؟

کیا ہمیں یہ سمجھنا چاہیئے کہ اس کا ادعائے رفاقت خلوص پر مبنی تھا؟ ابتداء میں بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ اس کی دعوت اخلاص پر مبنی ہے۔ لیکن آگے چل کر پتہ چلا۔ کہ اس کے نہاں خانۂ قلب میں بھی ایک خاص غرض پوشیدہ تھی۔ جب یہ غرض پوری ہو گئی تو مجاہدین کے متعلق اس کی روش بدل گئی۔ یہاں تک کہ مجاہدین کیلئے اس کے پاس ٹھہرنے کی کوئی صورت نہ رہی۔ درحقیقت پائندہ خان کی ہمشیرہ عبدالغفور خان رئیس اگرور سے منسوب تھی۔ پھر ناخوشگوار صورت واحوال کے باعث شادی میں تاخیر ہوتی گئی۔ جب پائندہ خان سید صاحبؒ کے مقابلہ میں شکست کھا کر سراسیمگی کی حالت میں بھاگا

تو مال و اسباب اور اہل و عیال کو پیچھے چھوڑ گیا۔ مولینا شاہ اسمٰعیلؒ نے عبدالغفور خان رئیس اگرور کے بھائی کمال خان سے کہہ دیا کہ پائندہ خان کے متعلقین اور اس کی تمام اشیاء بہ حفاظت موصوف کے پاس پہنچا دی جائیں۔ اس حکم کی تعمیل ہوئی لیکن خان اگرور نے موقع سے فائدہ اٹھا کر منسوبہ سے شادی کر لی اور پائندہ خان کی رضامندی اور شرکت کا انتظار نہ کیا۔ یہ حرکت عام حالات میں بھی نازیبا تھی۔ پریشانی کے خاص حالات نے اسے پائندہ خان کیلئے حد درجہ رنج افزا بنا دیا۔ یہ داغ اس کے دل سے مدت العمر نہ مٹا۔

ان حالات و واقعات کے باعث پائندہ خان اور خوانین اگرور کے درمیان مستقل عداوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ مجاہدین کو جسی کوٹ میں بٹھانے اور اگرور ان کے حوالے کر دینے کی غرض یہی تھی کہ خوانین اگرور کو اپنے علاقہ میں استقلال کا موقع نہ مل سکے گا۔ ہزارہ گزیٹیئر (مطبوعہ سنہ ۸۴-۱۸۸۳ء صفحہ ۲۸) میں مرقوم ہے کہ

"پائندہ خان نے ہندوستانی مجاہدین کو آلۂ کار بنا کر خان اگرور کو اس علاقہ سے نکلوا دیا۔"

پائندہ خان کی دور اندیشی اور دقیقہ سنجی قابل ستائش ہے کہ اپنے حقیقی مقصد کے متعلق مجاہدین سے کبھی کچھ نہ کہا۔ اور اس کی تکمیل حالات کی طبعی رفتار پر چھوڑ دی۔ ابتداء میں رئیس اگرور اور اس کا بھائی مجاہدین کے معاون بنے رہے۔ پائندہ خان نے اس پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ معلوم ہوتا ہے اسے یقین تھا کہ یہ تعاون زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکے گا۔ چنانچہ خوانین کی دورخی آشکارا ہو گئی۔ اور مجاہدین کو ان کے خلاف آخری اقدام کے سوا چارہ نہ رہا۔ یوں پائندہ خان کا مقصد پورا ہو گیا۔ ساتھ ہی اس نے ایسے طریقے اختیار کئے۔ کہ مجاہدین اگرور سے اٹھ کر ستھانہ جانے پر مجبور ہو گئے۔

یہاں یہ واقعات بیان کرنے مقصود ہیں کہ پائندہ خان سے اگرور میں قیام اور جسی کوٹ سے متعلق عہد وپیماں ہو جانے کے بعد مولوی نصیرالدین مجاہدین کو لے کر امب روانہ ہو گئے۔ پائندہ خان نے دو سو سواروں اور پیادوں کے ساتھ امب کے عین مغربی سرحد پر بھیٹ گلی کے مقام پر مولوی صاحب کا استقبال کیا۔ اور بڑے اعزاز سے امب لایا۔ مجاہدین کیلئے متعدد مکانات خالی کرائے اور بڑے اہتمام سے مہمان نوازی کے فرائض سرانجام دیئے۔ بظاہر معلوم ہو رہا تھا کہ اس کی روش اور خیالات و افکار میں نمایاں تغیر آچکا ہے۔ مولوی صاحب براستہ نکا پانی جسی کوٹ پہنچ گئے۔ جب قیام کیلئے مناسب مقام مل گیا تو اپنے مقصد کیلئے تدبیریں سوچنے لگے۔ کہ انہیں اپنی آرزوؤں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا خیال دامنگیر تھا۔ چنانچہ مولوی صاحب نے رفقاء سے صلاح ومشورہ کیا۔ میاں خان صواتی نے جبوڑی پر چھاپے کی تجویز پیش کی جو بالاکوٹ سے مغربی جانب درہ کونش بھوگرمنگ میں سکھوں کا اہم مرکز ہے۔ اس تجویز سے سب نے اتفاق کیا۔ اور ایک سو مجاہدین نماز فجر کے بعد جسی کوٹ سے روانہ ہوئے جبوڑی کا عام راستہ بھی پہاڑی ہونے کے باعث خاصا دشوار تھا۔ حفظ ماتقدم کے طور پر راستہ کے بجائے جنگلات سے گزرنا پڑا تاکہ کسی کو علم نہ ہو سکے۔ افتاں وخیزاں عشا کے وقت سے پہلے یہ لوگ اس پہاڑ کے دامن میں پہنچ گئے۔ جہاں جبوڑی کی بستی واقع ہے۔ رات کے پچھلے پہر اٹھ کر مجاہدین جبوڑی کے تھانے کی طرف بڑھے اور یکدم حملہ بول کر تھانے میں داخل ہو گئے۔ تھانے کے کچھ سپاہی مارے گئے۔ باقی بھاگ کر بستی کے گھروں میں جا چھپے۔ مجاہدین کو کوئی نقصان نہ پہنچا۔ دوسرے روز وہ جسی کوٹ پہنچ گئے۔ پورے علاقے میں مجاہدین کی دھاک بیٹھ گئی۔ بارک خان اور رحمد خان درہ کونش کے مشہور ومعروف خوانین تھے۔ انہوں نے مولوی نصیرالدین کے پاس خط بھیج کر اطاعت قبول کر لی۔ اور عشر دینے کا اقرار کر لیا۔ مولوی صاحب نے انہیں

تسلی دی۔ کہ آپ ہمارے بھائی ہیں۔ ہماری طرف سے کچھ اندیشہ و فکر نہ کریں۔ ہم
حتی الامکان آپ کی حفاظت کرتے رہیں گے۔ یہ صورت سکھوں کو کیونکر گوارا ہو
ہو سکتی تھی۔ انہیں یہ بھی شبہ ہوا کہ مجاہدین کا حملہ راستے کے مقامی باشندوں کی
اعانت کے سبب کامیاب ہوا ہے۔ اس پر انہیں غصہ آیا کہ درۂ کونش کے لوگ مجاہدین
کو عشر دینے پر راضی ہو گئے ہیں۔ اور اب وہ سکھوں کے زیر اثر نہیں رہے۔ چنانچہ وہ
گوشمالی کی خاطر لشکر لے کر آپہنچے۔ بارک خان اور محمد خان کو ڈرایا دھمکایا کہ اگر
مجاہدین کو عشر دیا تو تمہیں تباہ و برباد کر ڈالیں گے۔ ان ہر دو خوانین نے اس کی اطلاع
امیر المجاہدین کو دی کہ ہماری جانیں خطرے میں پڑ گئی ہیں۔ مولوی صاحب اور مجاہدین
نے خیال کیا جو لوگ ہماری اعانت کا اقرار کر چکے ہیں انہیں بروقت امداد دینا ہمارا فرض
ہے۔ مولوی صاحب جبسی کوٹ سے روانہ ہو کر بالی منگ پہنچے جہاں طرفین کے درمیان
گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ اور سکھ شکست کھا کر فرار ہو گئے۔ ادھر سے فارغ ہونے کے
بعد مولوی صاحب شل گئے۔ بارک خان اور محمد خان نے معمول کےمطابق انہیں دعوت دی۔
اس سے پیشتر ایک عقیدت مند نے آگاہ کر دیا کہ ہر دو خوانین دو رخی چال چل رہے
ہیں۔ ابتداء میں ان کے متعلق خیال تھا کہ سکھوں کے خطرے کی روک تھام کے بعد وہ
نہایت اخلاص سے فریضۂ جہاد میں معاونت کریں گے۔ لیکن یہ خیال محض سراب ثابت
ہوا۔ ان خوانین کی بے عزمی اور ڈوں ہمتی واضح طور پر آشکارا ہو گئی۔ درحقیقت
ان کے سامنے کوئی نصب العین نہ تھا۔ انہیں اپنی جائدادیں بچانے کی فکر تھی۔
اور وہ اپنے ذاتی مقاصد کیلئے کوشاں تھے۔ ویسے بھی غلاظت میں رینگنے والے
کیڑے شاہین کی پرواز کو کب جان سکتے ہیں۔ جب مجاہدین کا دباؤ بڑھتا تو بظاہر ان
کی ہمدردی و خیر خواہی کا دم بھرنے لگتے۔ اور خفیہ خفیہ سکھوں سے بھی رابطہ قائم
رکھا۔ انہیں اپنی اطاعت کا یقین دلاتے رہے۔ یہ صورتِ حال مجاھدین کے لئے

تشویشناک تھی۔ مجاہدین کی دلی تمنا تھی کہ خوانین دو رخی سے ان کے اقدامات میں خلل نہ ڈالیں لیکن سر بکف مجاہدین کی یہ آرزو کسی بھی دور میں پوری نہ ہو سکی مقامی لوگوں کی بے عزمی، متلوّن مزاجی ہر نازک وقت میں آفات کا موجب بنتی رہی نتیجہ یہ ہوا کہ نہ کسی موقع پر مستقل جہاد ہو سکا۔ اور نہ ہی غدار اور ایمان فروش خوانین تازیانے کی ضرب سے محفوظ رہ سکے۔

ہم پائندہ خان اور دوسرے خوانین میں مقابلہ کرتے ہیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مجاہدین کو اگرور میں بٹھانے کا فیصلہ کرتے وقت پائندہ خان کے پیش نظر ایک بڑا مقصد تھا کہ خوانین اگرور کیلئے مستقل قیام کی صورت پیدا نہ ہو سکے۔ اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ وہ سکھوں سے بھی لڑنے کا خواہاں تھا اور جب تک گرد و پیش کی مصلحتیں اس کے مخصوص تصورات حکومت میں حائل نہ ہوئیں وہ سکھوں کے خلاف وقتاً فوقتاً اقدام کرتا رہا۔ دوسرے خوانین مثلاً فتح خان پنجتار کی حیثیت پائندہ خان سے مختلف تھی۔ وہ صرف اپنی سرداری کو مستحکم کرنے کے خواہشمند تھے۔ حالانکہ مجاہدین اسلام بلادِ اسلامیہ کو غیر مسلموں کے تسلط سے نجات دلانے کیلئے برسرِ پیکار تھے۔ اور ان کا مقصد اعلائے کلمۃ الحق اور "اسلامی ریاست" کا قیام تھا۔ پائندہ خان اپنے مقاصد کی تکمیل کے علاوہ مجاہدین کے مقاصد میں بھی تعاون کیلئے تیار تھا۔ چنانچہ اس نے مولوی نصیرالدین کو جبسی کوٹ پیغام بھیجا کہ ہم پکھل میں سکھوں پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ آپ بھی تشریف لے چلیں۔ یہ پیغام ملتے ہی مولوی صاحب ڈیڑھ سو مجاہدین کے ساتھ شیر گڑھ پہنچ گئے۔ اور یہاں سے بھورج درہ ہوتے ہوئے نیلو رپہنچے۔ جہاں تین روز تک قیام رہا۔ روزانہ سواروں کو گرد و نواح کے دیہات میں گشت کیلئے بھیج دیا جاتا۔ ان میں کہنیاں خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ وہاں سے شمالی جانب

بھیر کنڈ میں سکھوں کا مضبوط قلعہ تھا۔ باہم صلاح و مشورہ کے بعد اُس پر حملے کا فیصلہ کیا گیا۔ خان اور مجاہدین کے سوار اور پیادے تقریباً ڈھائی ہزار تھے نمازِ ظہر ادا کر کے کہنیاں سے بھیر کنڈ پر یورش کی گئی۔ سکھوں کی جمعیت چار ہزار کے قریب تھی۔ مجاہدین نے دریائے سرن عبور کیا۔ طرفین کے مابین دست بدست جنگ ہوئی۔ تھوڑی ہی دیر میں سکھ میدان چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ کچھ کانٹوں کی باڑ میں اٹک گئے جو قلعے کی حفاظت کیلئے لگائی گئی۔ وہ وہیں مارے گئے۔ مجاہدین باڑ کے دروازہ تک پہنچ گئے۔ پائندہ خان جو مجاہدین کی یورش کا نظارہ کر رہا تھا نے اپنے دو مشہور سالاروں شاما اور مہندا کو بھیج کر مولوی صاحب اور مجاہدین کو واپس بلا لیا اور کشادہ دلی سے اعتراف کیا کہ مجاہدین کی بہادری اور جواں مردی کے متعلق جو کچھ سنا تھا اس سے زیادہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔ اس لڑائی میں مجاھدین کا کوئی آدمی زخمی نہ ہوا جب کہ سکھوں کے پچاس ساٹھ آدمی مارے گئے۔ مغرب کی نماز دریائے سرن کے کنارے ادا کی گئی۔ پائندہ خان نے مولوی صاحب سے کہا کہ آپ بھورج درہ میں انتظار کریں۔ میں ملک پور سے ہوتا ہوا شام تک آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ مولوی صاحب نے چالیس پچاس مجاہدین امان اللہ خان لکھنوی کی سرکردگی میں پائندہ خان کے ہمراہ کر دیئے۔ تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد پائندہ خان نے امان اللہ خان سے کہا کہ آپ دریائے سرن کے ساتھ ساتھ چلیں۔ میں اوپر سے چکر کاٹ کر موضع بیرال سے ہوتا ہوا آپ سے آملوں گا۔ اور آپ نے دو سو سپاہی امان اللہ خان کے ساتھ روانہ کر دیئے۔

سکھوں کی طرف سے ملک پور میں تھوڑے تھوڑے مسلمان سپاہی متعین تھے امان اللہ خان دریا کے نشیب سے ہوتے ہوئے دونوں گڑھیوں کے درمیانی

جا کھڑا ہوا۔ مسلمان سپاہیوں نے بظاہر مجاہدین کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ مکی کے بھٹے منگوا کر دیئے۔ کہ بھون بھون کر کھائیں۔ چنانچہ سب نے اطمینان سے ظہر کی نماز ادا کی۔ لیکن خفیہ خفیہ ملک پور کے متعینہ مسلمان سپاہیوں نے چادر ہلا ہلا کر بھیر کنڈ میں سکھوں کو پیغام بھیج دیا کہ جس قدر جلدی ہو سکے آؤ اور ان مجاہدین کو ختم کر دو۔ تھوڑی دیر کے بعد سکھ آ گئے۔ بندوقوں سے مجاہدوں پر فائرنگ شروع ہو گئی ملک پور کی ہر دو گڑھیوں کے مسلمان سپاہیوں نے مجاہدین پر کنکروں پتھروں اور گولیوں کی بارش شروع کر دی۔ امان اللہ خان نے یہ حال دیکھتے ہی نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ مجاہدین تلواریں لے کر سکھوں پر ٹوٹ پڑے۔ اور انہیں بھگا دیا۔ اس کشمکش میں میاں خان صواتی[1] گڑھی والوں کی گولیوں سے شہید ہو گیا

---

[1] میاں خان صواتی کو نیلور میں دفن کیا ہے۔ ملاحظہ ہو "سرگذشت مجاہدین" ص۳۰ از مولانا غلام رسول مہر۔ یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اسی نام کے ایک مجاہد میاں خان صواتی اور برادر شس حقیقی محمد عثمان خان شنگیاری کے قریب جانب جنوب داؤدر ایک فرلانگ کے فاصلے پر بر لب سڑک باغ وار (BAGWAR) کے مقام پر دفن ہیں۔ یہ ہر دو مجاہد حضرت سید احمدؒ کے ہمراہ بالاکوٹ میں شہید ہوئے۔ ان کی میتوں یہاں دفن کیا گیا۔ ان کے تیسرے حقیقی بھائی زمان خان نے ۱۹۰۰ء میں دو سو برس کے بعد وفات پائی۔ وہ بھی سکھوں کے عہد شوریدہ سر ہونے کے باعث طویل عرصہ علاقہ غیر میں مفرور رہے۔ اور "لنڈی مسلمانی" کے دور میں علاقہ غیر سے واپس ہوئے۔ ان ہر سہ برادران کے والد گرامی فیض طلب خان ساکن جبوڑی ہیں۔ اول الذکر بالاکوٹ میں شہید ہو کر باغوار میں مدفون ہوئے۔ اور زمان خان کی اولاد سے ۱۔ ہیبت خان۔ ۲۔ مظفر خان۔ ۳۔ بہادر خان۔ ۴۔ بوستان خان۔ ۵۔ محمد آجون خان۔ ۶۔ محمد ایوب خان ہیں (باقی ص۳۱ پہ)

امان اللہ خان حملہ آور سکھوں کے فرار کے بعد سپاہیوں سے مخاطب ہوئے کہ "ہم اپنے بھائی کے خون کا بدلہ لیں گے" اور گڑھیوں کے تمام سپاہیوں کو قتل کریں گے اس لئے کہ انہوں نے دغابازی سے کام لیا۔"

ان کمینہ فطرت لوگوں نے ایک سیّد کو واسطہ بنا کر خطا معاف کرائی اور کہا کہ اگر ہم سکھوں کو اطلاع نہ دیتے تو وہ یہ سمجھتے کہ ہم پائندہ خان اور مجاہدین سے ملے ہوئے ہیں۔ اس لئے سکھ ہمیں نقصان پہنچاتے۔ اس بحث و تکرار کے بعد ان کا قصور معاف ہوا۔

امان اللہ خان تکھنوی نے میاں خان صواتی کی میت چارپائی پر اٹھوائی اور شام کے وقت لشکر کے ہمراہ نیلوریہ پہنچ گیا۔ وہیں دفن کیا۔ پائندہ خان بھی شام تک آ گیا۔ پھر وہ شیر گڑھ ہوتا ہوا امب چلا گیا اور مولوی صاحب اپنے مرکز جسی کوٹ چلے گئے۔

اس کے بعد پائندہ خان نے مانسہرہ کے قدیمی تاریخی شہر پر پے بہ پے حملے کئے جہاں سکھوں کی عملداری تھی۔ اس زمانہ میں خاص مانسہرہ دو حصوں میں منقسم تھا۔ ایک حصہ زیریں قوم صواتی کا تھا۔ جس کی سربراہی سدم خان کے ذمہ تھی۔ دوسرا حصہ شہر قوم تنولی کی نگرانی میں تھا۔ سکھوں نے اہلیان مانسہرہ کو یکجا جمع کر کے میدان ڈب میں نزد مسجد احمد دین مقابلہ کرایا۔ جبکہ باشندگانِ مانسہرہ کے لشکر کی قیادت سدم خان کے سپرد تھی۔ دوران جنگ پائندہ خان کے نیزہ کی ضرب سے سدم خان مارا گیا۔ جس کی قبر سابق قبرستان مانسہرہ میں ہے جو نزد ڈاک بنگلہ پل ہے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ سے آگے۔

اور ثانی الذکر کی اولاد سے خواجہ محمد خان، سلطان خان (پنشنر سب انسپکٹر پولیس) اور شوکت علی خان ایڈووکیٹ (موجودہ امیر جماعتِ اسلامی ضلع ہزارہ) ہیں۔

جہاں آج کل " تحصیل کونسل ہال" موجود ہے۔ اس کی وفات پر سکھوں نے پسرش کلاں محمد زمان خان کو مانسہرہ کا خان اور نمبردار تسلیم کیا۔ اور از راہ خدمات تین دیہات مستاجری جس کو آج کل نمبرداری کہتے ہیں۔ اور تین جندرات مانسہرہ شہر میں دیئے۔ مانسہرہ، چیڑ بڑ، میرا جمدلی گاؤں عطا کئے۔ اور کچھ اراضی موضع وارا دخلی مانسہرہ میں دی گئی۔

دوران جنگ شہر کی مدافعت کیلئے بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا۔ اہالیان شہر پتھروں سے مقابلہ کر کے حملہ آوروں کو پسپا کر دیتے تھے۔ اس وقت بدقسمتی سے طرف تنولی کا خان شاہ ولی خان تھا۔ جس کو پائندہ خان نے قوم تنولی کی عزت کا واسطہ دے کر کہا کہ جب میں رات کو حملہ کروں تو شمالی جانب نزد مسجد ہٹ کرڑ کانٹوں کا دروازہ کھول دینا تا کہ بطور فاتح مانسہرہ سے گزر سکوں۔ چنانچہ شاہ ولی خان نے اس کی آواز پر لبیک کہا اور راتوں رات اسے مانسہرہ کا فاتح بنا دیا۔ صرف ایک مکان کو نذر آتش کر کے لشکر پائندہ خان کامیاب ہو گیا۔ علی الصباح شہر کے سرکردہ افراد نے شاہ ولی خان کو معزول کر دیا اور اس کی جگہ فیض طلب خان نمبردار مقرر ہوا۔ ۱۸۷۲ء میں انگریزی عملداری میں کام پیمائش و بندوبست اول ضلع ہزارہ ہو کر جائداد ہر قسم مالکان و قابضین کے حوالے کر دی گئی اور نمبرداری، جاگیرداری جو پہلے سکھ حکومت نے جاری رکھی تھی۔ اب حکومتِ برطانیہ نے بھی اسے جاری رکھا۔ شاہ ولی خان کی اولاد بندوبست اول تحصیل مانسہرہ میں بطور مزارعان درج ہوئی۔ جس کی اولاد ماسٹر نواب خان (والد تاج محمد خان وغیرہ) دارا داخلی مانسہرہ میں موجود ہے۔ اغلباً انہی وجوہ سے قوم سواتی اور قوم تنولی کی عداوت و خصومت کی ابتدا ہوئی اور بعد میں اگرور کے واقعات نے اس عصبیت کی ہوا کو اور تیز کر دیا۔

مزید یہ بھی روایت ہے کہ پائندہ کے حملوں کی یلغار کی آخری سرحد مانسہرہ سے مشرقی جانب ڈیڑھ دو میل کے قریب راقم الحروف کے گاؤں حدو باندی تک ہوتی تھی، جہاں سکھوں کا مستحکم قلعہ تھا۔ یہ بھی مشہور رہے کہ اس گاؤں کو پائندہ خان نے کئی بار نذر آتش کیا اور یہ از سر نو آباد ہوا۔ مانسہرہ شہر کی تسخیر اور حدو باندی کی نیست و نابود کے بعد پائندہ خان کی دھاک بیٹھ چکی تھی۔ اب مجاہدین کے مقاصد کے مطابق فضا سازگار ہو رہی تھی۔ اس اثناء میں سکھوں نے بے پناہ لشکر کے ساتھ ڈیرے جما لئے اور اپنا اثر و رسوخ بھی درۂ کونش میں مستحکم کر لیا۔ بٹل کے خوانین بارک خان اور محمد خان بھی ان سے مل گئے۔ اس کے ساتھ ہی سکھوں کا خاصا لشکر شنکیاری سے اٹھ کر سچوں (موجودہ سچہ) میں جمع ہو گیا۔ تاکہ قرب و جوار کے علاقوں سے خراج وصول کرے۔ مجاہدین بھی جوابی کارروائی پر مجبور ہوئے۔ مولوی صاحب تقریباً سوا سو مجاہدین کو لے کر قلعہ شاہی خان سے روانہ ہوئے۔ کچھ مقامی لوگ بھی ہمراہ ہو گئے۔

مجاہدین نے چھتر کے وسیع میدان میں پہنچ کر لاچی منگ نامی سیدوں کی بستی میں قیام کیا اور چالیس پچاس نوجوان اس غرض سے بٹل روانہ کئے کہ ہر دو خوانین کو ساتھ لے آئیں۔ جب مجاہدین کی آمد کی خبر معلوم ہوئی بارک خان اپنے دس آدمیوں کے ہمراہ اس پہاڑ کی جانب بھاگا جہاں سکھوں کا لشکر ٹھہرا ہوا تھا۔ مجاہدین نے تعاقب کیا اسے گرفتار کر لائے۔ جس مقام پر مولوی صاحب قیام پذیر تھے وہ بستی سے ایک میل باہر واقع تھا۔ مجاہدین بارک خان سے باتیں کر رہے تھے

"خان صاحب! آپ بڑے دانا اور جہاندیدہ ہیں خداوند تعالیٰ نے آپ کو سرداری عطا کی ہے۔ نہایت افسوس کا مقام ہے کہ آپ کا بحیثیت مسلمان ہونے کے مسلمانوں کی امداد کرنا فرض ہے۔ لیکن آپ سکھوں

سے مل گئے ہیں۔"

اس نے جواب دیا۔

"سبب یہ ہے کہ سکھوں کا پلہ بھاری ہے۔ وہ صاحب ملک اور صاحب حکومت ہیں۔ اور تم لوگوں کو صاحب شوکت و سلطنت نہیں دیکھتا آج یہاں ہو کل کہیں اور چلے جاؤ گے۔ اگر صاف صاف تمہارا شریک ہو جاؤں تو کہاں رہوں"[1]

یہ سنتے ہی ایک مجاہد کو اتنا غصہ آیا کہ اس نے بھری ہوئی قرابین چلا دی۔ اور بارک خان وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اور اس کی لاش اس کے ساتھیوں نے لاچی منگ میں دفن کر دی مجاہدین لاچی منگ سے روانہ ہو کر رچھاڑی پہنچے۔ رچھاڑی اور سچہ کے درمیان دریائے سرن حائل تھا۔ دونوں لشکر آمنے سامنے دونوں کناروں پر کھڑے گولیاں چلاتے رہے اور دست بدست لڑائی نہ ہو سکی۔ تین دن اسی طرح گزرنے کے بعد چوتھے روز مولوی صاحب نے مقیم خان ساکن کالا باغ کو مجاہدین کی جماعت کے ساتھ بچول بھیج دیا۔ جہاں مجاہدین اور سکھوں کے درمیان ایک جھڑپ ہوئی۔ مجاہدین میں سے دو شہید اور دو زخمی ہوئے سکھ شکست کھا کر فرار ہو گئے۔ حریت پسند مجاہدین واپس مولوی صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد مولوی نصیر الدین کی اجازت سے پکھلی پر شبخون مارنے کی غرض سے مقیم خان ڈیڑھ سو مجاہدین کے ہمراہ قلعہ شاہی خان سے روانہ ہوئے اور پہلی منزل سنگل کوٹ میں کی۔ جو درہ کونش میں پیر خیلوں کی بستی ہے۔ اور سید قمر علی شاہ ان کا رئیس تھا مجاہدین وہاں سے چل کر موضع اہل (AHEL) پہنچے تو مجاہدین جاسوسی کی غرض سے مختلف سمتوں میں روانہ کئے تاکہ شبخون کیلئے مقامات کا تعین کیا جا سکے۔ جونہی مقیم خان اہل سے روانگی کے

---

[1] ملاحظہ ہو "سرگذشت مجاہدین"۔ جلد چہارم صہ ۵۸ از مولانا غلام رسول مہر

بعد کوٹلیاں کے مقام پر پہنچا، تو جاسوسوں نے اطلاع دی کہ شبخون کیلئے کوئی جگہ موزوں نہیں ہے، کیونکہ ہماری آمد سے پیشتر باخبر ہو چکے ہیں۔ اور جا بجا قلعے اور چوکیاں بنا کر خاصی فوج متعین کر چکے ہیں۔ مقیم خان نے مایوس ہو کر فیصلہ کر لیا کہ دریائے سرن کے کنارے کنارے گشت کرتے ہوئے چلیں۔ اور درہ جوگڑ منگ سے ہوتے ہوئے شاہی خان چلے جائیں۔ چنانچہ مجاہدین روانہ ہوئے۔ اچھڑیاں کے گاؤں میں ایک چشمے کے کنارے کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ اچھڑیاں کے متصل شنکیاری دو ڈھائی میل کے فاصلے پر سکھ فوج کا مرکز تھا۔ ایک مجاہد نے کھانا کھاتے ہوئے اٹھ کر شنکیاری کی جانب بہ نظر غور دیکھا تو معلوم ہوا کہ سکھوں کا انبوہ کثیر چلا آ رہا ہے۔ چنانچہ تمام مجاہدین مدافعانہ کارروائی کیلئے ہتھیار سنبھال کر کھڑے ہو گئے چند ثانیے بعد سکھوں کی فوج نمودار ہوئی۔ تقریباً نو سو افراد تھے جن میں سوار کم اور پیادہ زیادہ تھے۔ درمیان میں دریائے سرن حائل تھا۔ مجاہدین دریا کے کنارے کنارے اوپر کی جانب روانہ ہوئے۔ تاکہ موزوں مقام سے دریا عبور کر کے دوسرے کنارے پر لڑیں۔ سکھوں نے سمجھا کہ مجاہدین افراد کی قلت کے باعث پہلو تہی کر رہے ہیں اس اثناء میں فریقین کی جانب گولیاں چل رہی تھیں۔ ایک مقام پر عبدالغفار خان جمعدار ساکن پکھلی نے مجاہدین کو پکارا کہ

"بھائیو! دیکھتے کیا ہو؟ آؤ! ان پر دھاوا بول دیں ــــــ"

یہ کہتے ہوئے عبدالغفار خان دریا میں کود پڑا۔ کمر سے اوپر پانی تھا۔ تاہم وہ گولیوں کی بارش میں پار اتر گیا۔ باقی مجاہدین نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ بیس پچیس سکھ وہیں مارے گئے۔ باقی بدحواس ہو کر بھاگے۔ مجاہدین نے دھڑیال نامی بستی تک ان کا تعاقب کیا۔ جو تقریباً ڈھائی کوس پر تھی۔ وہاں تک ستر اسی سکھ ہلاک ہوئے۔ مجاہدین میں سے کسی کو خراش تک نہ آئی۔ مقتول سکھوں کے ہتھیار لے کر مجاہدین

سنگل کوٹ اور لاچی منگ میں ٹھہرتے ہوئے واپس قلعہ شاہی خان پہنچ گئے مجاہدین کی واپسی کے بعد دشیئوں نے شورش برپا کر دی۔ اطلاع ملی کہ ایک مجاہد خدا بخش بلند کوٹ میں شہید کر دیا ہے اور اسی طرح موضع اتھل میں فیض محمد متعین تھا وہ موت کے گھاٹ اتار دیا ہے اور رات کی تاریکی میں ایک مجاہد شیخ لکھ میر پر حملہ ہوا جو بلند کوٹ کی مسجد کے حجرے میں رہائش پذیر تھا لیکن وہ شمشیر زنی کے کمالات سے کام لیتے ہوئے چار آدمیوں کو زخمی کر کے بچ نکلا اور بخیر و عافیت شاہی خان پہنچ گیا۔ دشیئوں کو سب سے زیادہ عداوت ملا کاتب اخوندزادہ سے تھی جو ان کے علاقے میں تحصیل کا حاکم اعلیٰ تھا اسے بروقت اطلاع مل گئی۔ اور وہ رات کو ننگے بدن بھاگ کر شاہی خان پہنچ گیا۔ باقی مجاہدین کے متعلق بھی تشویش ہوئی لیکن سب یکے بعد دیگرے کسی نہ کسی طرح جان بچا کر شاہی خان پہنچ گئے۔ دشیئوں کا منصوبہ ناکام رہا۔ اب وہ مجبورتی کے مقام پر جمع ہونے لگے۔ شیخ ولی محمد نے حفاظتی اقدامات کئے کہ قلعے کے قریب پانی کے چشمے پر برج بنوا کر پہرہ بٹھا دیا تاکہ آب رسانی کا سلسلہ منقطع نہ ہو سکے ان حالات سے مولوی نصیرالدین کو سوچ درہ مطلع کیا کہ جلد از جلد واپس تشریف لائے۔

پائندہ خان اس وقت سکھوں کے خلاف معاندانہ کارروائیوں میں مصروف تھے مزید پیش قدمی کی تجویز ملتوی کر دی۔ خود امب چلا گیا اور دو ارھائی سو تنولی سپاہ جمعدار کی سرکردگی میں مولوی صاحب کے ساتھ شاہی خان روانہ کر دیئے۔ جب دشیئوں کی طرف سے کوئی اقدام نہ ہوا۔ تو جمعدار نے شیخ صاحب اور مولوی صاحب کی اجازت سے خود [illegible] کی ایک معقول [illegible] تیار کو [illegible] ساتھ [illegible] [illegible]

طور ہزاروں کی تعداد میں شاہی خان پر حملہ آور ہوئے۔ ادھر سے مولوی صاحب اور مہندا جمعدار ان کے مقابلے کیلئے نکلے۔ راج دواری کا سردار، سردار بلند خان سب سے آگے بڑھ کر حملہ آور ہوا۔ اس نے سپاہیانہ جوہر دکھاتے ہوئے چار پانچ دشمنوں کو زخمی کر دیا۔ پھر باقی مجاہدین ان پر ٹوٹ پڑے۔ دشمن بدحواس ہو کر بھاگ گئے۔ ڈیڑھ کوس تک ان کا تعاقب کیا گیا اور تیس چالیس آدمیوں کا خاتمہ کر دیا گیا۔ مجاہدین میں سے صرف دو افراد نے شہادت پائی۔ چونکہ شام ہو گئی تھی۔ اس لئے مزید تعاقب مناسب نہ سمجھتے ہوئے مجاہدین واپس آ گئے۔

اسی اثناء میں خبر ملی کہ سکھ اسلحہ بارود کا بہت بڑا ذخیرہ دشمنوں کی امداد کیلئے بھیج رہے ہیں۔ اور صرف ساٹھ آدمی اس ذخیرے کی حفاظت پر تعینات ہیں۔ عبدالغفار خان ساکن پکھلی نے تیلی ٹرنگ اور سچ گوڑہ کے درمیان ان لوگوں پر چھاپہ مارا۔ اور سارا سامان لوٹ لیا۔

دشمن پسپا ہو کر مجبوری جا بیٹھے۔ اور قرب و جوار کے قبائل کو جمع کرنا شروع کر دیا۔ چرمی، بنگ، اندیاڑ اور ٹھیکری کے لوگ بھی ان سے مل گئے اور تمام راستوں کی ناکہ بندی کر دی۔ مجاہدین کیلئے یہ بہت بڑی مصیبت تھی کہ دس ہزار کے جم غفیر نے حملہ کر دیا۔ تو یہ لوگ بے تکلف جیسی کوٹ پر قابض ہو جائیں گے۔ اور مجاہدین کو اپنے مرکز سے [illegible] ہو نا پڑے گا۔ یہ بھی اندیشہ تھا کہ ان کی تعداد میں مسلسل اضافہ [illegible] ناممکن ہو جائیگا۔ اس لئے حملے کے انتظار کے بجائے پیش قدمی [illegible] گیا۔ مجاہدین بڑی بنگہ میں پہنچے جہاں قاضی عصمت اللہ [illegible] کے پیچھے پھر مجاہدین نے مجبوری [illegible] مجاہدین سے [illegible] آخری

سرحد پر پہنچ کر سانس لیا۔ ایک وفد کے ذریعے انہوں نے مصالحت کی درخواست کی اور احکام شریعت مان کر عشر دینا قبول کر لیا۔ اس کے بعد مجاہدین جب تک شاہی خان میں مقیم رہے۔ دیشیوں نے سرکشی اور تمرد کی کوئی حرکت نہیں کی۔

دیشیوں کی طرف سے مجاہدین کو اطمینان ہو گیا۔ مجاہدین شاہی خان چلے گئے اس کے بعد انہوں نے درۂ کونش بھوگڑ منگ میں جبڑ اور چھلے (موجودہ چھلہ باغ) نزد جبوڑی پر یکے بعد دیگرے کامیاب چھاپے مارے۔ جہاں سے انہیں کافی مال غنیمت دستیاب ہوا۔ اب وہ شارکول کے قریب موضع کوٹ میں رک کر ٹبل پر شبخون کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اور ٹبل کی جانب ہر سہ راستہ جات: ۱۔ لاچی منگ۔ ۲۔ باخلہ۔ ۳۔ اروڑی میں رات کے وقت مجاہدین کے پہروں کا انتظام تھا کہ سکھوں کی طرف سے معمولی سا مخالفانہ اقدام ہو تو بر وقت مجاہدین کو کوٹ میں اطلاع ہو سکے۔ ایک رات اروڑی کے راستہ پر تعینات پہرہ دار نے دور سے گل توڑے چمکتے ہوئے دیکھے اور سمجھ لیا کہ سکھوں کا لشکر شبخون کے ارادے سے آرہا ہے۔ اس نے فوراً قرابین داغی اور ساتھیوں کو لیکر پہاڑ پر چڑھ گیا۔ باقی پہرہ دار اور کوٹ کے مجاہدین بھی ہوشیار ہو گئے۔

صبح صادق کا وقت تھا۔ مجاہدین صبح کی نماز پڑھ کر پہاڑ کی چوٹی پر جا پہنچے سکھ ان سے پچاس ساٹھ قدم نیچے رہ گئے۔ ان میں گڑھی کا خان حبیب اللہ خان بھی شامل تھا۔ جو سکھوں کو ٹبل میں لانے کا ذمہ دار تھا۔ مقیم خان ساکن کالا باغ نے سید میر جمعدار کو چالیس مجاہدین کے ساتھ پہاڑ کی چوٹی پر بٹھا دیا۔ اور خود

لے مہ سرگذشت مجاہدین" جلد چہارم صفحہ ۹۷ از مولینا غلام رسول مہر

اس نے اسی مجاہدین کے ساتھ سکھوں پر حملہ کر دیا۔ اس حملے کے دوران ایک گولی مدد خان قندھاری کے سینے پر لگی اور وہ یہ کہتے ہوئے جان بحق ہو گیا کہ

"بھائیو! میرا کام تمام ہو چکا ہے۔ میرے پاس ٹھہرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ سب سے آگے بڑھ کر دشمن کو ہلاک کرو۔"

مقیم خان نے نہایت جرأت و پامردی سے پے در پے تین حملے کئے۔ ہر حملے میں پندرہ بیس سکھ مارے جاتے تھے۔ بالآخر سکھوں کیلئے پسپا ہونے کے سوا چارہ نہ رہا۔ مجاہدین میں سید میر نامی ایک نوجوان گوجر بھی شامل تھا جو لڑائی کے دوران پہاڑ کی چوٹی پر دوڑتا پھرتا تھا۔ اور بہ آواز بلند کہتا تھا:

"شاباش! بھائیو شاباش! دشمنوں کو خوب مارو، مولوی صاحب کمک لے کر آ رہے ہیں۔"

ایک جھاڑی میں چند سکھ چھپے بیٹھے تھے۔ ان کی گولی سے سید میر شہید ہو گئے۔ اور سکھ بے نیل و مرام واپس چلے گئے۔ مجاہدین میں سے دو شہید (مدد خان اور سید میر) اور چھ زخمی ہوئے۔ ملا الہام الدین کے کلے پر زخم آیا۔ نور محمد قندھاری کی کلائی زخمی ہو گئی۔ فتح محمد خان تنولی کے سینے اور علی اکبر خان صواتی کی ران میں گولی لگی دو ولایتی زخمیوں کے نام معلوم نہ ہو سکے اس واقعے کے بعد مولوی صاحب کی ہدایت پر کوٹ کے پاس پہاڑ کی چوٹی پر ایک برج بنوایا گیا۔ جہیں باقاعدہ پچاس مجاہد رہنے لگے۔

مجاہدین آزادی وطن کیلئے جدوجہد کر رہے تھے اور مقامی لوگ انہی کے خلاف سازشوں میں شریک ہوتے تھے اگرچہ سکھ ان کی جان، مال اور آبرو کے احترام سے سراسر بے پرواہ تھے تاہم ان کے خلاف یہ لوگ کوئی قدم اٹھانے کیلئے تیار نہ تھے۔ اس رنج افزا صورت حال پر کون سا دردمند

خون کے آنسو نہ بہائیگا کہ "تحریک اسلامی" کے نصب العین سے بغاوت کر کے مسلمانوں کے خون سے کھیلنے کیلئے مختلف علاقوں کے خوانین و رؤساء نے محض اپنی جاگیروں کی حفاظت کے جنوں میں اور ذاتی اغراض کی خاطر سکھوں سے ساز باز کی مگر باطل شکن مجاہدین کی ہمت و پامردی کے باعث انہیں مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا پائندہ خان کی یورشوں نے عبدالغفور خان اور کمال خان کو اگرور سے نکال دیا۔ اور وہ تکری کے مقام چوبلان میں مقیم ہوئے۔ گڑھی کا خان، حبیب اللہ خان ــــ عبدالغفور خان کا حقیقی ماموں تھا۔ اور کھلم کھلا سکھوں سے ملا ہوا تھا عبدالغفور خان نے اسے مجبور کیا کہ سکھوں کا لشکر لے کر مجاہدین کو ختم کر دے تاکہ یہ علاقہ خالی ہو جائے۔ اور میں سکھوں کی سرپرستی میں اپنا اقتدار پا سکوں۔ جب سکھ پھلی میں قلعہ بنا کر بیٹھ گئے۔ اور مجاہدین کوٹ میں برج کی تعمیر کے بعد ان کے مقابلہ کیلئے تیاریوں میں مصروف تھے تو عبدالغفور خان کا ایک خط حبیب اللہ خان کے نام پکڑا گیا جس کا مضمون یہ تھا:۔

> "تم چار پانچ ہزار سکھوں کی جمعیت رکھتے ہو۔ اور سو سوا سو مجاہدین تم سے دو کوس پر کوٹ میں پڑے ہیں۔ اگر ان پر شبخون مارو۔ اور انہیں مار لو تو قلعہ شاہی خان تک تمہارا عمل دخل ہو جائے۔ اور جو تمہارے مقابلے سے بھاگ کر ادھر آئیں گے ان کو میں سمجھ لوں گا۔ اور وہاں قلعہ شاہی میں تمہارا مقابلہ کوئی نہ کرے گا۔"

جب کوٹ میں عبدالغفور خان کے قاصد سے یہ خط برآمد ہوا۔ اس امر کا مزید ثبوت تھا کہ عبدالغفور خان معاندانہ حرکتوں کیلئے بدستور سرگرم ہے اور سازشوں کے جال پھیلا رہا ہے۔ حالات سے مجبور ہو کر مقامی آدمیوں اور مقامی مجاہدوں نے بطور خود عبدالغفور خان اور کمال خان کو ختم کرنے کی

اسکیم بنالی۔ چنانچہ ملا گلزار خیبری، نور محمد خورد جلال آبادی اور اخوندگل پشاوری پچاس ساٹھ آدمیوں کے ساتھ عبدالغفور خان کو ٹھکانے لگانے کیلئے چوہان گئے۔ وہاں پہنچ کر مسجد میں جا ٹھہرے۔ جس کے تین اطراف میں نالہ بہتا تھا۔ مسجد کی سمت ہموار میدان تھا۔ عبدالغفور خان اپنے دو آدمیوں کے ساتھ مسجد میں آیا۔ وہ حقیقت حال کو بھانپ گیا۔ تھوڑی دیر وہاں بیٹھا۔ پھر یہ کہتے ہوئے اٹھا کہ میں گڑھی جا کر آپ لوگوں کیلئے کھانے پینے کا بندوبست کرتا ہوں۔ اخوندگل پشاوری نے ساتھیوں سے کہا۔ دیکھتے کیا ہو ہلہ بول دو۔ سب لوگ تلواریں لیکر دوڑے۔ عبدالغفور خان نالے کی طرف بھاگا۔ نور محمد نے قرابین ماری اور نشیب میں گر کر جان بحق ہو گیا۔ قرابین کی آواز سنتے ہی دریبانی پہاڑی کی چوٹی پر بیٹھے ہوئے ان لوگوں نے حسب پروگرام بندوقیں داغ دیں۔ کوٹ میں عبدالغفور خان کے مارے جانے کی خبر اسی وقت پہنچ گئی کمال خان پہلے ہی اپنے آدمیوں کے ہمراہ آیا ہوا تھا۔ ملا لعل محمد قندھاری اور مقیم خان مشورے کی غرض سے کمال خان کو جھپٹ پڑے گئے۔ اس کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ جسے دیکھنے کے بہانے ملا لعل محمد نے لے لیا۔ مقیم خان نے قرابین ماری۔ کمال خان گرتے ہی ختم ہو گیا۔ اور صرف یہ الفاظ اس کے منہ سے نکلے: "مقیم خان تم نے دغا کی"! اس بات کی اطلاع قلعہ شاہی خان میں شیخ ولی محمد کے پاس پہنچی تو موصوف اور مجاہدین رنجیدہ ہوئے۔ اسی وقت شیخ صاحب نے حسن خان عظیم آبادی، کریم اللہ خان میواتی، کریم بخش سہارنپوری اور ملا الہام الدین کو ضروری انتظامات کیلئے چوبان بھیج دیا۔ انہوں نے عبدالغفور خان کی تجہیز و تکفین کا انتظام کیا۔

بعد ازاں عبدالغفور خان اور کمال خان کے بال بچوں اور ان کے دونوں بھتیجوں اللہ داد خان اور رحمت خان کی دیکھ بھال کیلئے خاطر خواہ اہتمام کر دیا۔ ان واقعات سے صاف عیاں ہے کہ عرصہ دراز کے بعد پائندہ خان کی آرزوئے انتقام پوری ہوئی۔ وہ خوانین کو ٹھکانے نہ لگا سکتا تھا۔ مگر قدرت کی جانب سے اس امر کا انتظام ہو گیا۔ یہ پائندہ خان کے تدبر کا کمال ہے کہ اس نے مجاہدین کو جسی کوٹ میں بٹھاتے وقت اشارۃً بھی اس مقصد کا ذکر نہ کیا تھا اسے یقین واثق تھا کہ مجاہدین کو جسی کوٹ بٹھانے سے اصل مقصد پورا ہو جائیگا۔ مجاہدین کے خواب وخیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اگروڑیوں سے کسی نوع کی کشمکش پیدا ہو گی۔ عبدالغفور خان کی دو رخی پالیسی نے معاملات کو بگاڑ دیا۔ دونوں بھائیوں میں سے کمال خان کا قتل اس لئے افسوسناک ہے کہ اس سے مجاہدین کے خلاف عناد کی کوئی حرکت سرزد نہ ہوئی۔ جیسا کہ مولوی نصیر الدین خود اعتراف فرما چکے ہیں۔ اور ولایتی مجاہدوں نے غالباً اس وجہ سے قتل کیا کہ ممکن ہے کمال خان بعد ازاں بھائی کے خون کا بدلہ لینے کیلئے ہنگامہ بپا کرے۔ بہرحال اس کے مظلوم مارے جانے سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔[1]

مجاہدین نے ادھر سے فارغ ہو کر تمام تگ و دو جبل کی جانب مبذول کر دی۔ کیونکہ سکھوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو ختم کرنے کے سوا اور کوئی چارہ

---

[1] "وقائع" جلد سوم ص ۱۲۶۷ کی روایت ہے کہ سید صاحب پنجتار سے ہجرت کر کے پکھلی کی طرف آئے تو کمال کی خواہش تھی کہ انہیں اگروڑ میں دعوت دے۔ مگر عبدالغفور خان کی پس وپیش کے باعث اس پر عمل نہ ہو سکا۔

نہ تھا۔ مجاہدین سورۂ القریش کا ورد کرتے ہوئے منزل کی جانب چل پڑے۔ سکھوں کی تعداد چار پانچ ہزار سے کم نہ تھی۔ سنگر کے قریب مجاہدین اور سکھوں میں خونریز لڑائی ہوئی۔ جس میں چار سو کے قریب سکھ مارے گئے۔ دوسری جانب ستر زخمی اور پچاس سے زیادہ مجاہدین شہید ہوئے۔ ملّا لعل محمد قندھاری، برکات مظفر آبادی، عطا محمد مظفر آبادی، عبدالستار پشاوری، شاہین خان مشوانی ساکن علاقہ گنگر نزد تربیلہ، رحیم بخش ساکن ہانسی، میر مردان علی میرٹھی کے سوا کسی کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ البتہ یہ انکشاف بعد میں ہوا۔ کہ سکھوں نے گڑھی اور سنگر کے درمیان ایک لمبی سی قبر کھود کر تمام شہیدوں کو اس میں دفن کرا دیا۔ ہمراہی مسلمانوں نے بتایا کہ یہی مجاہدوں کا گنج شہیداں ہے ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

دیشی اور اگرور کے قیام کے دوران مجاہدین نے جو جنگیں لڑیں ان میں جبّل کی لڑائی سب سے زیادہ خونریز تھی۔ جس میں صرف لال میر خان نشان بردار نور محمد کوہاٹی زندہ بچے۔ تقریباً ستر مجاہد زخمی ہوئے۔ اس جنگ میں مجاہدین کا ناقابل تلافی نقصان ہوا۔ ملا لعل محمد قندھاری جیسے مایۂ ناز فرزند اسلام شہید ہوئے۔ مولوی نصیر الدین کے ہمراہیوں میں ملا لعل محمد قندھاری کو وہی بلند مقام حاصل تھا۔ جس پر سید صاحب کے رفقاء میں سے شاہ اسمٰعیل شہیدؒ فائز تھے اس نڈر اور اولوالعزم مجاہد نے اس زمانے میں سید صاحب کی رفاقت کی جب آپ بہ عزم جہاد قندھار سے کابل کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ کم و بیش سات سال تک "تحریکِ مجاہدین" کے روح رواں بنے رہے۔ اکثر معرکوں میں انہیں سبقت کا شرف حاصل ہوا۔ صاحب ہمت و متقی بزرگ تھے۔ انہوں

نے زندگی کا ایک ایک لمحہ جہاد فی سبیل اللہ میں گزارا۔ اور وطن مالوف سے ہزاروں میل دور غربت میں شہادت پائی۔ جنگ مردان کے بعد شاہ اسمٰعیلؒ نے دو مجاہدوں کے کارناموں کو بہت قابل قدر قرار دیا۔ ایک مولوی مظہر علی عظیم آبادی دوسرے لعل محمد قندھاری جو جنگ مردان میں گولیوں کی بارش میں سینہ سپر رہے اور معرکہ میں چٹان کی طرح ثابت قدم رہے۔ مجاہدین کے پیش نظر یہ مقصد تھا۔ کہ سکھ ٹبل سے نکل جائیں۔ مجاہدین کی جانفشانی سے اس جنگ میں یہ آرزو پوری ہو گئی۔ اگرچہ اس جدوجہد میں مجاہدین کو بھی سخت نقصان برداشت کرنا پڑا۔ ٹبل کا جہاد غازیان اسلام کی بیمثال شجاعت وہمت کا ایک ناقابل فراموش کارنامہ تھا۔ اگر انہیں پائندہ خان کی بدعہدی سے سابقہ نہ پڑتا تو بہت جلد ضلع ہزارہ میں ایک مستحکم محاذ آزادی قائم کر لیتے۔ چند سال بعد رنجیت سنگھ کی وفات پر سکھوں میں ابتری پھیل گئی۔ اور ان کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ اگر اس موقع پر مجاہدین اسلام کا کوئی محاذ ہوتا تو یہ لوگ پورے صوبہ سرحد کو قبضہ میں لیکر "اسلامی مملکت" کی داغ بیل ڈالتے۔ پھر یقیناً مسلمانوں کی تاریخ میں غلامی کا باب اتنا طویل نہ ہوتا۔

واقعات شاہد ہیں کہ جب خوانین اگرور کا خاتمہ ہو گیا یعنی پائندہ خان کے اس خطرے کا استیصال ہو گیا۔ جو مجاہدین کو لانے کا موجب بنا۔ تو پائندہ خان کی روش بدل گئی۔ اور وہ حیلے بہانے سے مجاہدین کو نکالنے کی تدبیریں سوچنے لگا بعض روایات سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ مختلف مقامی خوانین و رؤسا نے پائندہ خان کی توجہ اس جانب مبذول کرائی۔ کہ ہم آپ کے فرماں بردار رہیں گے۔ آپ کو باقاعدہ خراج ادا کریں گے

لیکن یہ شرط ہے کہ مجاہدین کو نکال دیجئے۔ بہرکیف پائندہ خان اپنے عہد پر قائم نہ رہا۔ اور مجاہدین کو مسلسل یہ خبریں آنے لگیں۔ کہ وہ اپنی عادت کے مطابق پرپیچ چالیں اختیار کرنے کے درپے ہے۔ پھُلرؔ کے عظیم معرکہ کے بعد ان غازیوں نے خداوند تعالیٰ کے بھروسہ پر اپنی جد و جہد جاری رکھی۔ حتیٰ کہ موضع بیاری میں (الائی اور رندھاڑ کے مابین) مجاہدین کی الائی کے مقامی لوگوں سے چپقلش ہوئی، جو سکھوں کے تعاون سے شبخون مارنا چاہتے تھے۔ اس مہم میں مقیم خان جیسا جوانمرد مجاہد شہید ہوا۔ جس نے مختلف مہموں میں نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ اس نامور سپوت کی شہادت کے باوجود ان کے عزم و استقلال میں کوئی فرق نہ تھا۔ صرف اپنے مسکن (ہیڈ کوارٹر) کے متعلق گہری سوچ و فکر میں تھے۔ اس وقت یقین ہو گیا کہ پائندہ خان سے مفاہمت کی کوئی امید نہیں امیر جماعت کے مشورے کے بعد مجاہدین قلعہ شاہی خان والئی امب کے آدمیوں کے حوالے کرکے جسی کوٹ چلے گئے۔ پائندہ خان سے تعلقات منقطع ہو جانے کے بعد جسی کوٹ میں ٹھہرنا ناممکن تھا۔ پائندہ خان والئی امب نے بلاوجہ انہیں قلعہ شاہی خان سے اٹھایا اسی لئے امکان تھا جسی کوٹ کو بھی مجبوراً چھوڑنا پڑے گا۔ اس تذبذب کی حالت میں مجاہدین اپنے حقیقی مقصد کیلئے کچھ نہ کرسکے۔ انہوں نے ان حالات کے متعلق سید اکبر شاہ ستھانوی کو اطلاع بھیج دی۔ اس لئے کہ پورے علاقۂ سرحد میں صرف وہی ایک شخصیت تھی جس کے اخلاص اور مستقل اعانت پر بھروسہ کیا جا سکتا تھا۔ سید ممدوح نے جواب کہلا بھیجا

"آپ ستھانہ چلے آئیں۔ یہ آپ کا گھر ہے۔ جب تک چاہیں رہیں۔ ہم خدمت گزاری میں حتی المقدور قصور نہ کریں گے۔"[1]

---

[1] "وقائع" جلد سوم ص ۱۱۵

شیخ ولی محمد اور مجاہدین ستھانہ چلے گئے۔ اور اندازہ ہے کہ مجاہدین ۱۸۳۵ء تک جبسی کوٹ اور شاہی خان میں رہے (ہزارہ گزیٹیر اردو ص۲۳۳) میں یہ مدت تین برس بتائی گئی ہے) مجاہدین کو پائندہ خان والئی امب نے اس خیال سے اٹھایا کہ دیشی، شیکری، نندھاڑ اور الائی کے علاقے مطیع و فرماں بردار رہیں گے درحقیقت یہ سب سکھوں سے ملے ہوئے تھے اور پائندہ خان کے جانی دشمن تھے صرف مجاہدین اس سیلاب کیلئے "سدِّ سکندریہ" بنے ہوئے تھے لشکر مجاہدین کے ستھانہ جانے کے بعد دیشیوں نے جمع ہو کر شاہی خان پر حملہ کر دیا۔ اور پائندہ خان کے لوگوں کو وہاں سے نکال دیا۔ بلکہ ایک توپ بھی چھین کرلے گئے۔ اسی طرح ۱۸۳۶ء میں سکھوں نے اگرور پر حملہ کر دیا۔ اور یہ علاقہ بھی پائندہ خان سے چھین گیا۔ اس کے بعد دریا کے بائیں کنارے دور دراز تک سکھوں کا عمل دخل ہو گیا۔ پائندہ خان کے قبضہ میں دریا کے دائیں کنارے پر چھوٹا سا علاقہ رہ گیا۔ جس وسیع سلطنت کے وہ خواب دیکھ رہا تھا۔ مجاہدین کے جانے کے بعد وہ درہم برہم ہو گئی تاہم وہ سکھوں سے لڑتا رہا۔ اور ۱۸۴۴ء میں راہی ملک عدم ہوا۔ یقین واثق ہے کہ زندگی کے آخری ایام میں اسے اپنی غلطی پر ندامت و پشیمانی تھی۔ مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ افسوس اور موہوم امیدیں اس کے بگڑے ہوئے کارخانے کیلئے سود مند ثابت نہ ہو سکتی تھیں۔

مجاہدین متواتر تین سال تک بہ اطمینان ستھانہ میں رہے۔ ۱۸۳۶ء تک مجاہدین کی سالاری کا منصب مولوی نصیر الدین منگلوری کو حاصل رہا۔ اور ان کی شہادت کے بعد جب مولوی نصیر الدین دہلوی مجاہدین کے مرکز ستھانہ پہنچے۔ تو وہ امیر بنا دیئے گئے لیکن ابھی وہ کوئی کارنامہ سرانجام نہ پا سکے تھے۔ کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ مولینا غلام رسول مہر صاحب کا خیال ہے "۱۸۴۰ء میں ان کا انتقال ہوا" ان کے حلت

فرمانے پر "تحریک مجاہدین" کا پہلا دور ختم ہوا۔

برصغیر ہند و پاک میں احیائے دین اور اسلامی مملکت کے قیام کیلئے جانفشانی صرف ان افراد تک محدود تھی۔ جو سید صاحب کے آغوش فیض میں تربیت پا چکے تھے۔ اگرچہ اس وقت کروڑوں مسلمان موجود تھے۔ بڑے بڑے نواب، رؤسا و امراء اور مشائخ و علماء لیکن اسلامی حمیت کیلئے ایثار و قربانی کی تڑپ تحریک مجاہدین کے کارکنوں میں تھی۔ وہ جہاں اور جس حال میں تھے "ولی اللہی تحریک" کیلئے تگ و دو کرتے نظر آتے تھے۔ تاریخ کے اوراق سے شہادت ملتی ہے۔ کہ ان حق پرستوں نے شمع اسلام فروزاں کرنے کیلئے انتہائی نازک حالات میں بے پناہ قربانیاں دیں۔ جن کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ مولینا عنایت علی اور ولایت علی پوری سرگرمی سے دعوت تبلیغ میں مصروف تھے۔ انکی نگاہیں وقت اور فضا کے سازگار ہونے کی منتظر تھیں۔ تاکہ موزوں مقام سے جہاد کا آغاز کیا جا سکے۔ یہاں تک کہ سکھوں میں ابتری پھیلی۔ اور عملی میدان میں قدم رکھنے کا مناسب موقع پیدا ہو گیا۔

ھری پور ہزارہ اور کاغان کے رؤسا اور عوام سکھوں کے مظالم سے سخت نالاں تھے۔ ہزارہ میں ہری سنگھ دس بارہ سال صوبیدار رہا۔ اس کا پورا دور قتل و غارت اور خونریزی سے لبریز تھا۔ جب کاغان اور ہری پور کے رئیسوں نے سکھوں کو خانہ جنگی میں مبتلا دیکھا۔ تو وہ آزادی حاصل کرنے میں مصروف ہو گئے۔ راجہ حیدر بخش گکھڑ رئیس خان پور، نواب خان پلال رئیس سنگڑی، امیر خان رئیس کھلابٹ، غلام خان ترین۔ ان کے علاوہ

کاغان کے سادات بھی قابل ذکر ہیں۔ زیریں ہزارہ کے رؤسا نے سکھوں کی جمعیتوں کو شکست دے کر ہری پور پر قبضہ کر لیا۔ وہاں کا گورنر مول راج دیوالیہ حسن ابدال بھاگ گیا۔ کشمیر کی جانب سے دیوان ابراہیم نے کاغان پر حملہ کیا۔ وہاں کے سیدوں نے سید ضامن شاہ (ساکن کوائی کاغان) کی سرکردگی میں دیوان پر چھاپہ مارا۔ جس میں خود اور اس کی پوری فوج موت کے گھاٹ اتر گئی۔ یہ مقام آج تک " دیوان بیلہ" کے نام سے مشہور رہے انہی ایام میں سید ضامن شاہ کاغانی نے مولینا ولایت علی کو دعوت بھیجی۔ کہ آپ یہاں تشریف لائیں۔ یہاں "آغاز جہاد" کیلئے سازگار فضا پیدا ہو چکی ہے مولینا موصوف نے اپنے بھائی عنایت علی کو بھیجنے کی تجویز کی۔ وہ اس وقت بنگال میں دعوتِ تبلیغ کا فریضہ سر انجام دے رہے تھے۔ جونہی انہیں سرحد جانے کا پیغام ملا۔ وہ دو ہزار مجاہدین کے ساتھ عظیم آباد پہنچے۔ اس سے حکومتِ برطانیہ کے کارکنوں میں تشویش پھیل گئی۔ مولینا نے دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے اپنی جمعیت کو منتشر کر دیا۔ تاکہ یہ لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں یکے بعد دیگرے چلتے جائیں۔ کیونکہ سکھوں کے علاقہ سے گزرنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہ تھی۔ جولائی ۱۸۴۳ء میں یہ لوگ اپنی منزل کیلئے روانہ ہوئے۔ چار پانچ ماہ تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ مولینا عنایت علی نے سرحد پہنچ کر سکھوں کو بالاکوٹ سے نکال دیا۔ مولینا ساداتِ کاغان اور دوسرے افراد کی امداد سے بالاکوٹ پر قابض ہو گئے۔ تو انہیں باقاعدہ امیر جہاد تسلیم کیا گیا۔ سید ضامن شاہ کاغانی نے بھی اطاعت قبول کر لی۔ اور آس پاس کے علاقے کو سکھوں کے تسلّط سے آزاد کرانے کیلئے جہاد شروع کر دیا۔ ان لوگوں نے گڑھی حبیب اللہ کو فتح کر لیا۔ پھر سکھوں کے قلعہ فتح گڑھ پر قبضہ کر لیا۔ مولینا مقصود علی

کی قیادت میں سلطان حسین خان نے مظفر آباد پر چڑھائی کی۔ مجاہدین کی تھوڑی تعداد کے باوجود خداوند کریم نے انہیں فتح و کامرانی سے سرفراز کیا۔ اوکنلے کے بیان کے مطابق (کلکتہ ریویو اکتوبر ۱۸۷۰ء صفحہ ۳۸۳)

"مجاہدین نے مظفر آباد پر پہلے حملے میں شکست کھائی دوسرے حملے میں سکھوں نے شکست کھائی اور جنوب کی طرف پسپا ہوئے مجاہدین نے سرگرمی سے تعاقب کیا۔ ان کی فتح کا حال سن کر پٹھانوں کی ایک جماعت ساتھ ہو گئی۔ سکھوں نے مانسہرہ میں قدم جمانے کی کوشش کی لیکن دوبارہ شکست کھائی غرض مجاہدین نے مختصر عرصہ میں اس خاصے بڑے علاقے پر قبضہ جما لیا جو دریائے سندھ سے بائیں کنارے کے ساتھ ہری پور سے کاغان اور ستھانہ سے کشمیر تک پھیلا ہوا تھا۔"

بعض مقامی رؤسا و خوانین نے مجاہدین کی حمایت کی۔ سلطان محمد خان رئیس بوئی، سردار محمد امین خان رئیس گڑھی حبیب اللہ (سردار حبیب اللہ خان کا بیٹا) نے بڑے خلوص سے مجاہدین کی اعانت کی۔ نواب خان رئیس شنگری نے سید صاحبؒ، بعد میں مجاہدین کا بھی ساتھ دیا۔ (۱۰ ہزارہ گزٹیئر میں بتایا گیا ہے کہ اس نے مجاہدین کو ساتھ لے کر "دوڑ" ندی کو عبور کیا اور مانک رائے (مانکرائے) پر قبضہ کر لیا۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ہزارہ کے حاکم مول راج نے نواب خان کو ایلچی بنا کر صواتیوں کے پاس بھیجا کہ وہ سرکشی نہ کریں۔ لیکن نواب خان نے حالات سکھوں کیلئے ناسازگار پائے۔ تو قلعہ شیروان پر قبضہ کر لیا۔ اور سردار پائندہ خان نے اپنے چھوٹے بھائی مدد خان تنولی کیلئے بھلڑہ کی جاگیر مقرر کی۔ اس نے دل و جان سے مجاہدین کی اعانت کی۔ سید ضامن شاہ رئیس کوائی (وادی کاغان) بھی مجاہدین کی معاونت میں شریک رہا۔ اسی نے مولانا عنایت علی

کو دعوت دے کر بلایا تھا۔ اس کی مدد سے بالاکوٹ فتح ہوا۔ اور مجاہدین کو بالائی ہزارہ میں حکومت قائم کرنے کا موقع ملا۔ اسی نے گلاب سنگھ والی کشمیر کے دیوان ابراہیم اور اس کی فوج کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ جس کے بعد سیّد ضامن شاہ نے انگریزی مداخلت کی مخالفت کی۔ اس وجہ سے اس کے خلاف ایک فوج بھیجی گئی۔ جس نے سادات کو گرفتار کر کے مشہور شہر بفہ میں نظر بند کر دیا۔ غالباً ۱۸۷۰ء میں سیّد ضامن شاہ راہی ملک عدم ہوا۔ اس کا بھائی نوبت شاہ بھی تمام مجاہدانہ سرگرمیوں میں شریک رہا۔

مقام تعجب ہے کہ حالات "تحریک آزادی" کیلئے جس تیزی کے ساتھ سازگار ہوئے اسی تیزی کے ساتھ مخالف ہو گئے۔ اسی سلسلہ میں درہ دب کی جنگ پیش آئی۔ ۶ر جنوری ۱۸۴۷ء میں انگریزوں کے زیر اثر گلاب سنگھ اور سکھوں کا اثر و رسوخ بحال ہو چکا تھا۔ اور خوانین ورؤسا انگریزوں کی تدبیر آرائیوں کے باعث ان کے دام تزویر میں آ گئے۔ مختصراً یہ کہ میدان جنگ میں مجاہدین کو جس سرگرم اعانت کی توقع تھی وہ پوری نہ ہوئی۔ اس کے برعکس انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ دب آج کل ضلع ہزارہ اور ضلع منظفر آباد کے درمیان واقع ہے فی الحال "دب" ڈونگ گاؤں کی داخلی ہے۔ اس جنگ کے باعث مجاہدین کی تمام تدبیریں ناکام ہو گئیں۔ حکومت برطانیہ کی سرپرستی میں سکھوں کی نئی طاقت کا ظہور ہوا۔ اولاد علی اعتمادی دوستوں کے جیش کے ساتھ اپنے سابقہ رفیقوں سادات ستھانہ کے پاس چلے گئے۔ ادھر مولینا ولایت علی اور مولینا عنایت علی کو سرکاری نگرانی میں ان کے وطن عظیم آباد بھیج دیا گیا۔ وہاں ان کے دس ہزار کے مچلکے لئے گئے۔ کہ دو سال تک شہر سے باہر نہ جائیں۔

ستمبر ۱۸۴۹ء میں مولینا آزاد ہو چکے تھے۔ اور انہوں نے علی الاعلان ہجرت

کی۔ اب بالائی ہزارہ پر گلاب سنگھ ڈوگرہ قابض تھا۔ اور ہنری لارنس ریذیڈنٹ کی سفارش پر منظور ہوا۔ کہ بالائی ہزارہ اس سے لے لیا جائے۔ بالائی ہزارہ کے مالیئے کی تشخیص کی گئی اور اس سے نصف مالیئے کا علاقہ جموں کے پاس گلاب سنگھ کے حوالے کر دیا گیا۔ ادھر "تحریک حریت" بھی بال و پر نکال رہی تھی۔ کہ آزادئ وطن کے پرستار حضرت مولینا ولایت علی اور مولینا عنایت علی ستھانہ پہنچ گئے۔ ان کے بعض ساتھیوں کو کھبل میں روکا گیا۔ مگر آدمی نکل گئے اونٹ روک لئے گئے۔ جن پر مال و اسباب تھا۔ انہیں ڈپٹی کمشنر ہزارہ کے پاس پیش کیا گیا۔ اس نے حکم دیا کہ جملہ سامان حفاظت کے ساتھ مالکوں تک پہنچایا جائے۔ مؤرخین کی روایت کے مطابق "قافلۂ انسانیت" کے علمبردار ۸ ربیع الآخر ۱۲۶۷ھ) ۱۰ فروری ۱۸۵۱ء) کو ستھانہ پہنچے۔ ان کے اہل و عیال آٹھ روز بعد ۱۶ ربیع الآخر یعنی ۱۸ فروری کو پہنچے

رئیس المجاہدین حضرت مولینا ولایت علی کو سرحد پہنچنے کے بعد بیس مہینے کی مہلت ملی۔ ابھی ابتدائی انتظامات ہی میں مصروف تھے کہ نومبر ۱۸۵۲ء بعارضہ خناق رحمت الٰہی کی آغوش میں پہنچ گئے۔ اس کے تین ماہ بعد مجاہدین نے علاقہ امب پر شبخون مارا اور عشرہ و کوٹلہ پر قبضہ کر لیا۔ ۲ اپریل ۱۸۵۴ء کو مولینا عنایت علی خاصی لمبی مدت چملہ، بنیر اور صوات میں گزارنے کے بعد واپس آگئے۔

جب تک مجاہدین کا مرکز ستھانہ کی سرزمین تھا ان کے حملے ضلع ہزارہ پر ہوتے رہے۔ منگل تھانہ پہنچنے کے بعد حضرت مولینا عنایت علی نے مجاہدین کو سمہ یعنی ضلع پشاور اور ضلع مردان کے درمیانی علاقہ کو یورشوں کیلئے تیار کیا۔ اوکنلے کا بیان ہے کہ مولینا عنایت علی نے اپنے ہمراہیوں کے دل میں انگریز کافروں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ مجاہدین روزانہ پریڈ کرتے۔ بلکہ اوقات دن میں

دو مرتبہ قواعد میں فضائل جہاد کے متعلق نظمیں پڑھی جاتیں۔ جمعہ کی نماز کے بعد بہشت کی شادمانیوں کے بارے میں وعظ کئے جاتے۔ اور انہیں تلقین کی جاتی کہ صبر و استقامت سے اس وقت کا انتظار کرو۔ جب برطانوی ہند کی تسخیر کی موعود ساعت آ پہنچے گی۔

مولینا عنایت علی نے گردوپیش جہاد کی دعوت اور مجاہدین کی تنظیم شروع کردی اور فوجوں میں بھی دعوت جہاد کا باقاعدہ انتظام کر دیا تھا جو بالآخر "غدر" کی شکل میں نمودار ہوا۔

تحریک مجاہدین کا بہ نظر عمیق جائزہ لیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ "آزادی وطن" کیلئے یہ سب سے پہلی تحریک تھی۔ جو دہلی کے راہگذاروں سے اٹھی اور بالاکوٹ کے مرغزاروں میں اس کے شرکاء نے خون بہایا۔ اس برعظیم میں مظلوموں کی دادرسی اور حق کی حمایت میں "اسلامی ریاست" کے قیام کیلئے اجتماعی لحاظ سے یہ پہلا خون تھا۔ بالاکوٹ کا پر عظمت مقام جو "عکس شہیدی" ہے۔ ان حق پرستوں کا یہ انمٹ نشان باشندگان ہزارہ کے پاس دہلی کی مقدس امانت ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ صداقت و دیانت اور اخلاص و ایثار پر مبنی تحریکیں قوت قاہرہ و جابرہ کے سامنے دب جایا کرتی ہیں ختم نہیں ہوا کرتیں۔ بلکہ زیر زمین مسلسل رواں دواں رہتی ہیں۔ اس طرح یہ تحریک بھی وقتی طور پر دب گئی۔ مگر شہادت گاہ بالاکوٹ میں ختم نہیں ہوئی۔ اس کی دبی ہوئی چنگاریاں لوگوں کے سینوں میں زندہ رہیں اور ایک نئے انداز میں یہ تحریک برابر کام کرتی رہی۔ مؤرخین کی رائے ہے۔ کہ ایک ہی وقت میں کام کرنے والے چھیاسٹھ خلفاء ہندوستان کے چھیاسٹھ مراکز سے اس تحریک کو اپنے اپنے دائرہ میں اپنی بساط کے مطابق چلاتے رہے یہ تحریک زیر زمین نہیں چلتی رہی بلکہ ابھر کر دوبارہ سامنے آئی۔ اور اس نے ایسے حالات پیدا کر دیئے۔ کہ حکمرانوں کی راتوں کی نیند حرام ہو گئی۔ یہ تحریک

سانحۂ بالاکوٹ کے بعد کم از کم پچاس سال تک برصغیر ہندوستان کے مختلف علاقوں میں برابر کام کرتی رہی۔ اور اہل تحقیق بتاتے ہیں کہ بیسویں صدی کے آغاز تک مجاہدین خاموشی کے ساتھ مختلف اطراف و اکناف میں کام کرتے رہے۔ اسی تحریک کا اثر ہے۔ کہ ہر ممکن کوشش کے باوجود مسلمانوں کا انگریزوں سے سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ مسلمانوں کی سامراج سے بغاوت اور تعاون نہ کرنے کا جذبہ اسی تحریک کا پیدا کردہ ہے۔ اس کی دبی ہوئی چنگاریاں ملک میں سلگ رہی تھیں۔ جو ۱۸۵۷ء میں برگ و بار لایا۔ جس نے اس کے بعد مسلمانوں کو انگریزوں سے برسرِ پیکار رکھا۔ خواہ وہ تحریک "ریشمی رومال" ہو یا "تحریک خلافت" یا "جلیانوالہ کا معرکہ" "واقعہ کانپور یا ترکِ موالات" "خاکسار تحریک" ہو یا "تحریک پاکستان" ان تمام تحریکات میں یہی روح کار فرما ہے۔ آزادی وطن کیلئے استعمار اور غلامی کا جوا کندھوں سے اتار پھینکنے کی خاطر جتنی بھی تحریکیں چلائی گئیں۔ وہ ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں تھیں۔ جو اپنے وقت اور موقع و محل پر آشکارا ہوتی رہیں۔

۱۸۵۷ء کے "غدر" کے متعلق حکومت برطانیہ کے دور میں صحیح واقعات کا لکھنا جرم تھا جو کچھ مغربی مؤرخین نے لکھ دیا اس کے اظہار کی بھی اجازت نہ تھی اس لئے یہ کہنا غیر مناسب نہ ہوگا۔ کہ ۱۸۵۷ء کی "جنگ آزادی" جسے انگریزوں نے "غدر" کا نام دیا۔ دنیائے تاریخ میں اب تک تہ بہ تہ پردوں میں مستور ہے تاہم ہندو مؤرخین نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اس کے روحِ رواں مسلمان تھے۔ اس بغاوت میں زیادہ حصہ علماء نے لیا ہے۔ در اصل یہ معرکہ حضرت سیّد احمد شہیدؒ کی تحریک کا ایک شعلہ تھا۔ ۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ سے اسی تحریک کا آغاز ہوا۔

اس تحریک کے محرک اور قائد و لیڈر وہ علماء تھے جو شاہ عبدالعزیزؒ اور

اور سید احمد شہیدؒ سے وابستہ تھے۔ حالانکہ نوجوں میں باہر کا کوئی فرد جا کر تبلیغ نہیں کر سکتا۔ پھر ان کو اس قدر منظم اور متحد کس نے کیا؟ ڈاکٹر ہنٹر جو اپنی سات سالہ تحقیق کے بعد یہ رپورٹ لکھتا ہے:۔

"ان سب تحریکوں کے کرتا دھرتا اور بانی وہابی مولوی تھے۔ اب بھی اگر تم ان کا قلع قمع نہ کرو گے تو ہندوستان میں ہمیشہ سازشوں کا سلسلہ قائم رہے گا۔"

ولی اللہ خاندان کے پس ماندگان نے دوسری تحریک ۱۸۵۷ء میں چلائی۔ جو سکھوں اور مسلمان رؤسائے پنجاب کی غداری سے ختم ہوئی جس میں ہندوستان کے معزز اور تاریخ ساز خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔ اور سر طاس کی کتاب "تذکرہ رؤسائے پنجاب" اس بات کی شاہد ہے کہ ۱۸۵۷ء میں ملک و ملت سے غداری کر کے ریاستوں اور جاگیروں کی بنیاد مجاہدین کی لاشوں پر رکھی گئی۔ ایک انگریز مصنف نے لکھا ہے کہ یہ لوگ اس جرأت و شجاعت سے لڑے تھے کہ افغانیوں کو بھی مات کر دیا۔ ایڈورڈ ٹسن کے اندازے کے مطابق جنگ آزادی کی ناکامی پر دہلی میں پانچ سو علماء شہید کر دیئے گئے۔ اضلاع روہیل کھنڈ میں پانچ ہزار علماء وحشت و بربریت کے سیلاب کے دھارے میں بہا دیئے گئے۔ اور بنگال میں اسّی ہزار علماء کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا۔ مگر جوش ایمانی سے لبریز اسلاف کی تاریخ کے گم گشتہ سپاہیوں کو یہ سختیاں اور آلام و مصائب کی یہ کڑیاں متاثر نہ کر سکیں۔ صوبہ سرحد کے جواں سال شاعر احمد فراز "

"شہدائے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے نام"

عقیدت کا یوں اظہار کرتے ہیں:۔

۵ لیکن اے جذبِ مقدس کے شہیدانِ عظیم

کل کی ہار اپنے لئے جیت کی تمہید بنی

ہم صلیبوں پہ چڑھے زندہ گڑے پھر بھی بڑھے

وادیٔ مرگ بھی منزل گہِ امید بنی

ہاتھ کٹتے رہے پر مشعلیں تابندہ رہیں

رسم جو تم سے چلی باعثِ تقلید بنی

شب کے سفاک خداؤں کو خبر ہو کہ نہ ہو

جو کرن قتل ہوئی شعلۂ خورشید بنی

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے پس منظر و پیش منظر کے متعلق آغا شورش کاشمیری مرحوم نے کہا۔

۵ دار پر اب جانشینِ بابر و تیمور ہیں

تاج کے وارث گدائی کے لئے مجبور ہیں

جعفرانِ دین و دانش ہیں حرم کے پاسبان

سینۂ ملت میں یہ رستے ہوئے ناسور ہیں

اس پُر آشوب دور میں مجاہدین صوبہ سرحد میں شمعِ حریت روشن کر رہے تھے کہ ۴ مئی ۱۸۵۸ء کو مجاہدین کی سرگرم اعانت کے باعث ستھانہ پہ مصیبت ٹوٹی۔ انگریزوں نے توپوں سے گولہ باری کر کے ستھانہ کو تہ و بالا کیا موجودہ شہر از سرِ نو آباد ہوا ہے۔ اسی سال جنرل کاٹن کی سرکردگی میں پشاور سے مجاہدین پر حملہ ہوا۔ مجاہدین نے خوب دادِ شجاعت دی۔ مگر بڑی تعداد میں شہید ہوئے۔ اور کچھ پہاڑوں میں چھپ گئے۔ مولینا عنایت علی نے ستھانہ کا رخ کیا مگر راستہ ہی میں بمقام چمبیٹی داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

مولانا عنایت علی کے بعد ۱۸۶۲ء میں ان کے بھتیجے مولانا عبد اللہ بن مولانا ولایت علی مجاہدین کے امیر قرار پائے۔ مولانا عبد اللہ زمام کار ہاتھ میں لیتے ہی تندہی اور مستعدی کے ساتھ فوجی تربیت میں لگ گئے۔ ان کے دور امارت کا سب سے اہم واقعہ "معرکہ امبیلا" ہے۔ ۱۸۶۳ء میں معرکہ امبیلا میں مجاہدین نے دین کی عظمت اور سربلندی کیلئے جس عزم و استقلال اور جانبازی کا مظاہرہ کیا اس سے انگریزی حکومت کے حوصلے پست ہوگئے۔ گو میدان انگریزی حکومت کے ہاتھ رہا۔ مگر اس کا بخوبی اندازہ ہوگیا۔ کہ سرحد کے مجاہدین کو انگریزی مقبوضات سے رسد، اسلحہ اور تازہ دم مجاہدین پہنچتے ہیں۔ اور ہندوستان میں اس کا سب سے بڑا مرکز صادق پور پٹنہ ہے۔ اور اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے معلوم نہیں کتنے مرکز ہیں۔ جنگ امبیلا کے بعد ۱۸۶۴ء میں "انبالے" کا مشہور معرکہ ہوا جس میں گیارہ ملزم محمد شفیع انبالوی، عبد الکریم، الٰہی بخش، میاں حسینی تھانیسری حسینی عظیم آبادی، عبد الغفور، قاضی میاں جان، مولوی یحییٰ علی، مولوی عبد الغفار مولوی عبد الرحیم، مولوی محمد جعفر تھانیسری تھے۔ اول الذکر چھ حضرات ابتلاو آزمائش میں ثابت قدم نہ رہ سکے۔ اور سرکاری گواہ بن کر ذلت و خواری کے ساتھ رہا ہوئے۔ البتہ پانچ حضرات نے ایمان و استقامت کا پورا پورا ثبوت دیا۔ قاضی میاں جان انبالہ جیل میں وفات پاگئے۔ مولوی یحییٰ علی نے جو تقویٰ اور ایمان و اخلاص کا نمونہ تھے۔ جزائر انڈیمان (کالاپانی) کو آرام گاہ بنایا۔ میاں عبد الغفار، مولوی عبد الرحیم اور مولوی محمد جعفر تھانیسری نہایت سخت جان نکلے اور اٹھارہ سال کی مدت انڈیمان میں گزار کر واپس وطن پہنچے

ان حالات کے باوجود مجاہدین کی سرگرمیاں ضلع ہزارہ میں جاری رہیں اور وہ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے مصروف عمل رہے

ان یورشوں کی پیش بندی کی خاطر کرنل راونی کی سرکردگی میں نومبر ۱۸۶۷ء میں اگرور کے مشہور و معروف مقام اوگی میں ایک فوجی چوکی قائم کی گئی۔" ہزارہ گزیٹیر" (ص ۷۹) کے مطابق حسن زئیوں، اکازئیوں، چغرزئیوں اور پریاری سیدوں پر مشتمل انبوہِ کثیر نے چوکی پر حملہ کر دیا۔ چوکی کے بائیس سپاہیوں نے مدافعت کی جس میں چھ آدمی مارے گئے اور چار افراد کو گرفتار کر کے بہت سا سامان اٹھا کر لے گئے۔ چنانچہ کرنل راونی بذاتِ خود فوج لیکر اگرور پہنچا رئیس اگرور عطا محمد خان کو گرفتار کر کے ایبٹ آباد بھیج دیا گیا۔ وادئ اگرور میں بے چینی اور خطرات کے آثار پا کر کرنل راونی وہاں بیٹھا رہا۔ انگریزوں نے بریگیڈیئر جنرل وائلڈ کو اس مہم کا سپہ سالار مقرر کیا۔ اس مہم کیلئے ساڑھے نو ہزار فوج جمع کی گئی۔ مہاراجہ کشمیر نے بارہ سو افراد بطور کمک سرحد بھیج دیئے۔ اس لشکرِ عظیم کا مختلف طبقات پر اثر ہوا۔ چنانچہ تکری، تندھاڑ کے حسن زئیوں اور صواتیوں نے مصالحت پر آمادگی ظاہر کی۔ البتہ چغرزئیوں، اکازئیوں، دیشی اور تھاکوٹ کے صواتیوں اور پریاری سیدوں سے مقابلہ رہا۔ اس معرکہ کی نسبت مستند روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستانی مجاہدین اس مہم میں قبائلی لشکر کے معاون رہے بلکہ اس کش مکش کی صفِ اول میں وہی تھے جنہوں نے ہر مقام پر سرفروشی کا مظاہرہ کیا۔ یہ واقعہ "کوہ سیاہ کی دوسری مہم" کے نام سے مشہور ہے۔ اس مہم کے دوران سیدوں نے تکری پر حملہ کیا۔ جس کی پاداش میں ان کا ایک گاؤں جلا دیا گیا۔ ۲۰ر اکتوبر کو انگریزی فوج چند قبائل کی صلح کی پیش کش کے باعث واپس آ گئی۔ ۱۸۷۰ء میں حکومت کو احساس ہوا کہ خان اگرور کو بے وجہ معزول کیا تھا۔ چنانچہ اس کی ریاست بحال کر دی گئی۔ اکازئیوں کو شبتوت گاؤں آباد کرنے کی ممانعت تھی۔ ۱۸۷۵ء میں ان سے تصفیہ ہو گیا۔ اسی دوران میں خان اگرور عطا محمد خان نے وفات پائی۔ اور اس کا بیٹا علی گوہر خان جانشین ہوا۔

ایک عرصہ کے بعد حسن زئیوں اور اگروریوں کے درمیان فسادات شروع ہو گئے جس کا اثر انگریزی علاقے پر بھی ہوا۔ حسن زئیوں کے ایک احمد علی خان کو اس کے دشمن فیروز خان نے ۱۸۸۰ء (فروری) میں قتل کر دیا۔ احمد علی خان مقتول کے بھائی ہاشم علی خان کی اولاد کیلئے مداخیل اٹھ کھڑے ہوئے۔ تاکہ اس کا انتقام لیا جائے۔
ان حالات کے باعث فیروز خان اپنی جان بچانے کی خاطر فرار ہو کر علاقہ امب میں روپوش ہو گیا۔ بہ امر مجبوری ہاشم علی خان اس سے بدلہ نہ لے سکا بلکہ فیروز خان کے بجائے اس کے ماموں مظفر خان اور سمندر خان کو قتل کر دیا کیونکہ وہ بھی احمد علی خان کے قتل میں شریک تھے۔ عطا محمد خان مرحوم رئیس اگرور کے تعلقات اپنے چچا زاد بھائی سے نہایت ناخوشگوار تھے۔ یہ زندگی میں بر سر پیکار رہے۔ یہ عداوت ان کی اولاد کو بھی میراث میں ملی جسے برقرار رکھنا انہوں نے خاندانی فریضہ سمجھا علاقہ اگرور کے چھ گاؤں اللہ داد خان کے بیٹے عبداللہ خان کو پٹے پر ملے ہوئے تھے۔ علیگوہر خان نے جانشینی کے بعد وہ پٹا منسوخ کرنا چاہا۔ عبداللہ خان اپنے مرکز دلبوڑی سے نکلا۔ اور آزاد قبائل کو اپنا معاون بنا کر شریک جنگ کر لیا۔ اس طرح تادیبی کارروائیوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا۔ جو "کوہ سیاہ کی تیسری مہم" کے نام سے مشہور رہے۔ یہ انتہائی تعجب کی بات ہے کہ ہاشم علی خان کے ایک چھاپے کی نسبت تحقیقات کے دوران کارکنان حکومت کو محسوس ہوا۔ کہ یہ چھاپہ خان اگرور کے ایما سے مارا گیا ہے۔ چنانچہ خان اگرور کو معزول کر کے لاہور میں نظر بند کر دیا گیا حسن زئیوں اور پریاریوں کے خلاف شدید اقدامات کئے گئے۔

۱۸ جون ۱۸۸۸ء کو ایک نیا حادثہ منظر عام پر آیا۔ جو حکومت کے لئے جارحانہ اقدام کا بہانہ بن گیا۔ میجر بیٹی (Battye) اور کپتان ارسٹن انیس سپاہیوں کے ہمراہ اوگی سے روانہ ہو کر برچار کے ٹیلے پر چڑھے مقامی لوگوں کا بیان ہے۔ کہ

وہ شکار کھیلنے کے لئے نکلے تھے۔ اور سرکاری بیانات کے مطابق وہ گردو نواح کے علاقوں کی تسخیر کے متعلق اندازہ کرنا چاہتے تھے۔ بہر حال مدعا کچھ بھی ہو ان پر ریوڑ چرانے والے گوجروں نے گولیاں چلائیں۔

سرکاری بیان کے مطابق ان پر سرکاری علاقہ میں حملہ ہوا لیکن اس دشوار گذار پہاڑ پر کوئی حد فاصل موجود نہ تھی جس سے یہ سمجھا جا سکتا کہ یہاں علاقہ سرکار ختم ہو کر قبائلی علاقہ شروع ہو گیا ہے۔ بندوق کی آواز سن کر گردو نواح کے بہت سے لوگ موقع پر جمع ہو گئے اس پر میجر بیٹی نے اپنے ہمراہیوں کو واپسی کا حکم دیا۔ ایک حوالدار دوران حملہ زخمی ہو گیا۔ میجر بیٹی اور کپتان ارسکن اسے بچانے کیلئے آگے بڑھے دست بدست لڑائی میں دونوں مارے گئے۔ جس پر مشہور کر دیا گیا کہ پریاری سید اور خان خیل بھی زیر قیادت ہاشم علی خان حملے میں پیش پیش تھے۔ بہر حال ۲۷ جون ۱۸۸۸ء کو عبداللہ خان جو کہ اللہ داد خان کا فرزند تھا ایک سو مجاہدین لے کر میدان (نزد بلوسی) سے آ گیا اس طرح "کوہ سیاہ کی تیسری مہم" کا آغاز ہوا۔ انگریزوں نے میجر میکوئن کو سپہ سالار بنایا۔ اس فوج کے دو بریگیڈ تھے ایک کا سالار جنرل گلبرتھ اور دوسرے کا جنرل چینر تھا۔ انگریزی فوج نے شنگلی پر قبضہ جما لیا۔ یہ لوگ پیش قدمی کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ تورو اور کوٹ کئی کے درمیان خونریز جنگ ہوئی۔ "ہزارہ گزیٹیر" کا بیان ہے کہ یہ لڑائی ندی کے کنارے ہوئی۔ قبائلی آس پاس جنگل میں چھپے ہوئے تھے ڈیڑھ سو افراد نے کمین گاہوں سے نکل کر انگریزی فوج پر حملہ کر دیا۔ رائل رجمنٹ نے بڑے استقلال کے ساتھ مخالفین پر گولیوں کی بارش کی۔ جس سے جنگ کا رخ پلٹ گیا بہت سے افغان ندی کے عمیق پانی میں غرقاب ہوئے۔ دیگر افراد تتر بتر ہو گئے لیکن مجاہدین مقابلے پر ثابت قدم رہے۔ وہ تلواریں سونت کر بجلی کی تیزی سے انگریزی سپاہ پر ٹوٹ پڑے۔ لیکن یکے بعد دیگرے شہید ہوئے۔ "ریسول" جانی نقصان کے متعلق

یوں رقمطراز ہے۔

"اس میدان میں اٹھاسی نعشیں گنی گئیں۔ جن میں سے اڑتالیس ہندوستانی مجاہدین کی تھیں۔"

میجر افسر جنگ کا بیان ہے کہ دوسرے روز جھاڑیوں میں انچاس نعشیں، ندی کے کنارے چھبیس، پتھروں میں انتالیس اور چھ ایک پہاڑ پر دکھائی دیں۔ ندی میں کتنے ڈوبے ان کا شمار معلوم نہیں ہوتا۔ گویا انگریزوں کو ایک سو بیس نعشیں ملی تھیں۔ اس جنگ میں ان کا کچھ نقصان ہوا۔ ان کے بڑے افسروں میں سردار جیتر سنگھ اور کپتان بیلی مارے گئے متعدد افسر زخمی ہوئے۔ اس لڑائی میں انگریزوں کی کامیابی کا دارومدار آتشیں اسلحہ کی فراوانی پر تھا۔ بعض روایات کے مطابق پانچسو مجاہدین شہید ہوئے۔ بات قرین صحت مانی جاتی ہے کہ پوری جمعیت قبائلیوں اور مجاہدین کے شہداء پر مشتمل ہو گی۔ تاہم صاف ظاہر ہے کہ قبائلی ابتدا میں جوش و خروش دکھانے میں پیش پیش تھے۔ مگر جم کر مقابلہ نہ کر سکے۔ اکازئی اور حسن زئی قبائل نے انگریزوں کی پیش کردہ شرائط قبول کرلیں۔ پھر پریاری سیدوں اور تکری والوں کے سر تسلیم خم ہو گئے۔ اور مجاہدین مقابلے پر تنہا رہ گئے۔

کوہ سیاہ کی تیسری جنگ کے بعد صلح کی ایک شرط یہ بھی ہوئی کہ قبائلی لوگ انگریزی فوج یا افسروں کو کوئی آزار نہ پہنچائیں گے جو انگریزی اور قبائلی علاقہ کے مابین پہاڑوں سے گزریں گے۔ اس میں سڑکیں بنانے کی توضیح نہ تھی۔ حکومت برطانیہ نے ۱۸۹۰ء میں اگرور سے کوہ سیاہ تک سڑکیں بنانے کا فیصلہ کیا۔ ایک لشکر میکوئن کی سالاری میں اوگی روانہ کر دیا گیا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ لشکر کوہ سیاہ کی چوٹی تک جا کر

لہ کوہ سیاہ کی جنگ صفحہ ۳۲

برطانوی حکومت کے تسلط کا علم نصب کر دے۔ قبائلیوں کو انگریزوں کی بدعہدی ناگوار گذری۔ چنانچہ سکندر خان (برادر ہاشم علی خان) نے خان خیل، حسن زئی اور اکازئیوں کی جمعیت کے ساتھ برچار پہنچ کر انگریزی فوج کے کیمپ پر حملہ کر دیا۔ ان حالات سے نپٹنے کے لئے حکومت نے ایک مہم جنرل ایلس کی زیر کمان تیار کی جس کیلئے دربند اور اوگی میں فوج اکٹھی کی جس کی تعداد چھ ہزار تین سو تھی۔ اور اس کے پاس اٹھارہ توپیں تھیں۔ مارچ ۱۸۹۱ء میں جنگ کا آغاز ہوا۔ یہ "کوہ سیاہ کی چوتھی مہم" کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس میں اکازئیوں اور حسن زئیوں نے کوئی قابل ذکر مزاحمت نہ کی۔ صرف ایک مقام پر شدید مزاحمت سے واسطہ پڑا۔ جہاں اہل بونیر، جدون اور ہندوستانی مجاہدین اور بعض دوسرے قبائل چغرزئی کے علاقے میں اس پہاڑ پر جمع تھے۔ جو حسن زئی اور بونیر کے مابین واقع ہے۔ یہ لوگ متعدد مقامات پر انگریزی فوج سے متصادم ہوئے۔ اس ضمن میں غازیکوٹ کی لڑائی کو اہمیت حاصل ہے۔ ہندوستانی مجاہدین نے ۱۸ مارچ شب تاریک میں ڈوگروں کی چوکی پر شبخون مارا۔ لیکن شدید نقصان اٹھا کر لوٹنا پڑا۔ اس جنگ کو جاری رکھنے کیلئے مزید قبائل جمع ہونے لگے۔ حکومت نے یقین دلایا کہ کسی کو نقصان پہنچانا مقصود نہیں دوسری طرف اپنی امداد کیلئے کمک طلب کر لی۔ بالآخر قبائلیوں نے غیر مشروط اطاعت کا اقرار کر لیا۔ حسن زئی، اکازئیوں، مداخیلوں، پریاری سیدوں اور چغرزئیوں نے عہد نامہ لکھ کر دے دیا۔ جس کی رو سے قبائلی کبھی اس امر کے روادار نہ ہونگے۔ کہ ہاشم علی خان ان کے درمیان آئے اور آباد ہو جائے۔ معاہدہ ہوا کہ قبائل میں سے کوئی بھی ہندوستانی مجاہدین کو اپنے ہاں مرکز بنانے کیلئے جگہ نہ دیگا حالانکہ اس جنگ میں

ھ "ہزارہ گزیٹیر"، صفحہ ۱۸۱

مجاہدین کو سخت نقصان پہنچا۔ ان قبائل نے مجاہدین کو وہاں سے نکال دیا، اور وہ نئے مرکز کی تلاش میں نکل پڑے۔ اماز یوں کے تعلقات ان دنوں اپنے ہمسائے مبارک خیلوں سے خوشگوار نہ تھے۔ چنانچہ امیر المجاہدین مولینا عبداللہ کو مبارک خیلوں نے ٹیلوائی کا گاؤں اجاڑنے پر مجبور کر دیا، اور ان کی حیات مبارک کے باقی ایام اسی جگہ بسر ہوئے۔ بلاشبہ وہ آزاد رہنا چاہتے تھے وہ صرف تنہا آزاد رہنے کے آرزومند نہ تھے بلکہ سب کو آزادی کی نعمت سے شاد دیکھنا چاہتے تھے۔

ان دنوں حکومت ہند نے جنرل ڈیورنڈ کی سرکردگی میں امیر عبدالرحمٰن خان فرمانروائے افغانستان کے پاس ہندوستان اور افغانستان کے درمیان سرحد متعین کرنے کیلئے بھیجا۔ اس کی طے کردہ سرحد اب تک "ڈیورنڈ لائن" کے نام سے مشہور ہے۔ امیر عبدالرحمٰن خان یہ بات قبول کرنے کو تیار نہ تھا، کہ سرحد متعین کرنے کے بعد آزاد علاقہ انگریزوں کے تسلط میں چلا جائے مگر مخالفت کی سکت نہ رکھنے کے باعث بادل نخواستہ اس نے حد بندی کے معاہدے پر دستخط کر دیئے۔ اس کے بعد انگریزوں نے باقاعدہ حد بندی شروع کر دی۔ جس سے آزاد قبائل میں شدید اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔

دوسری ہندوستان سے باہر ترکی اور یونان کے درمیان ۱۸۹۵ء میں جنگ ہوئی اور عام مسلمان بے حد پریشان تھے کہ مغربی حکومتیں ترکی کی اسلامی سلطنت کو ختم کر دینے کے درپے ہیں۔ سرحدی ملاؤں نے بالکل بجا پروپگنڈہ شروع کر دیا، کہ انگریز ہندوستان سے باہر معاندانہ مقاصد پورے کر رہے ہیں۔ اور آزاد قبائل کے بااثر اور شوریدہ افراد کو وظیفے دے کر خاموش رکھنا چاہتے ہیں۔ اس طرح وہ باہر کے اسلامی

لے "العبرت"، صفحہ نمبر ۱۳ و ۱۴ مرتبہ سید عبدالجبار شاہ ستھانوی

ممالک کے مسلمانوں کو نقصان پہنچائیں گے۔ تو بالآخر آزاد قبائل کی آزادی محفوظ
نہ رہ سکی۔ بعض غلط اطلاعات بھی پھیلا دی گئیں۔ جنہیں "نیوبل" نے اپنی کتاب
"نہایت خوفناک" قرار دیا۔ یقیناً ایسا ہمہ گیر ولولہ پہلے کبھی پیدا نہ ہُوا تھا۔

۱۸۹۶ء-۹۷ء کا ذکر ہے کہ انہیں حالات نے صوبہ سرحد کے مختلف علاقوں میں معرکہ
آرائی کے مواقع فراہم کر دیئے۔ سب سے خونریز جنگ مالاکنڈ میں ہوئی۔ بونیر کے ایک
ملا سعد اللہ خان عرف مستانہ فقیر اس جنگ میں پیش پیش تھے۔ ملا صاحب نے مہمندوں
کے علاوہ تیراہ کے آفریدیوں، وزیروں اور مسعودوں اور دیگر قبائل میں بھی جہاد کا
زبردست جوش و خروش پیدا کر دیا۔ جس کے شعلے تین سال تک بھڑکتے رہے۔ اسی
موقع پر امیرالمجاہدین مولینا عبداللہ صاحب نے بھی اعلانات شائع کئے۔ اور مقاصدِ
جہاد کو ہر ممکن تقویت پہنچائی۔ ملا صاحب ان لوگوں میں سے تھے۔ جن کا وجود قوموں
کیلئے سرمایۂ افتخار ہوتا ہے۔ وہ اپنی غیور فطرت اور حریت پسندی کے باعث زندگی
کے آخری سانس تک انگریزوں کے خلاف برسرِ پیکار رہے۔ وہ اخوند صاحب
سوات سے فیضیاب تھے۔ اور خود ان کے عقیدت مندوں میں سے حاجی صاحب
ترنگ زئی اور ملا سنڈا جیسے اشخاص شامل تھے۔ ان حضرات کی تدبیروں کے متعلق رائے
خواہ کچھ ہو لیکن انکی غیرت و حمیت، حبِ وطنی اور جذبۂ ایمانی کے بارے میں شبہ کا تصور
بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ان لڑائیوں میں مولینا عبدالجبار شاہ ستھانوی بھی مجاہدین کی طرف
سے شریک ہوئے۔ اس کے بعد درۂ خیبر اور تیراہ کے آس پاس کے علاقے بھی میدان کارزار
بنے لیکن ان لڑائیوں سے مجاہدین کا کوئی تعلق نہ تھا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد مجاہدین کے قائد
حضرت مولینا عبداللہ ۲۹ر نومبر ۱۹۰۲ء کو چوہتر سال کی عمر میں جہان فانی سے رحلت فرما
گئے۔ اس کے بعد مولینا عبدالکریم مجاہدین کے امیر منتخب ہوئے۔

ان ایام میں ہندوستان کے مسلمانوں میں جوش حمیت کی پہلی لہر ۱۸۹۵ء کی

جنگ یونان اور ترکی کے دوران اٹھی۔ اسی وقت سے اس ہمہ گیر احساس کا آغاز ہوا کہ تمام مغربی حکومتیں مختلف حیلوں و بہانوں سے مسلمانوں کی آخری بڑی سلطنت کو ختم کرنے کیلئے کوشاں ہیں۔ جو کم و بیش چار سو سال سے حامل خلافت ہونے کے باعث عقیدت کا مرکز چلی آتی تھی۔ علاوہ ازیں اس کو پاسبان حرمین شریف کی سعادت حاصل تھی۔ مسلمان سلطنت عثمانیہ کو اس سبب سے اپنی بیش بہا متاع سمجھتے تھے کہ وہ آخری بڑی اسلامی سلطنت تھی۔ اور منصب خلافت کی حامل تھی۔ اسے مذہبی تقدس حاصل تھا۔ ہندوستانی مسلمانوں میں کئی قومی لیڈر نمایاں ہو رہے تھے۔ جن میں بعض کو بلند مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ مثلاً مولینا محمد علی جوہر، مولینا شوکت علی، مسیح الملک حکیم اجمل خان، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور مولینا ابوالکلام آزاد۔ باقی لیڈروں کی عام حیثیت تھی۔ لیکن مولینا ابوالکلام آزاد نے "الہلال" کے ذریعے قرآنی دعوت کا سلسلہ ایسے دلپذیر انداز میں شروع کیا کہ سیاسی لیڈر ہونے کے علاوہ وقت کے ممتاز دینی رہنما بھی سمجھے جانے لگے۔ آزادیٔ وطن کی تحریک میں انہیں منفرد مقام حاصل تھا۔

تحریک ریشمی رومال

اٹھارویں اور انیسویں صدی میں آزادی اور انقلاب کی جتنی بھی کوششیں ہوئیں۔ ان سب کے رہنما اور محرک علماء ہی تھے۔ اور نبرد عشق میں سب سے زیادہ وار انہی پر پڑے۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ ہماری تاریخ آزادی انہی لوگوں کے عزم اور ایثار کا مجموعہ ہے۔ اور انہی فدایانِ اسلام کی عظمتِ کردار کی وجہ سے ہماری تاریخ تابندہ اور درخشندہ ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ برصغیر ہندو پاک کی آزادی کیلئے معرکۂ بالاکوٹ ۱۸۳۱ء اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد یہ تیسری سرفروشانہ تحریک تھی جو "تحریک ریشمی رومال" کے نام سے انمٹ نقوش چھوڑ گئی۔ تحریک مجاہدین مسلمانوں کے جاہلانہ تغافل سے ناکام ہوئی۔ لیکن دوسری اور تیسری تحریکیں ان کے مجرمانہ عدم تعاون اور کھلے بندوں غداری کے باعث ملیامیٹ ہوئیں۔ ان تینوں تحریکوں میں بنیادی اور مرکزی کردار علمائے حق نے ادا کئے۔ انقلاب ۱۸۵۷ء میں عام مسلمانوں کا حصہ زیادہ ہے۔ لیکن "تحریک مجاہدین" اور "تحریک ریشمی رومال" کا سہرا تمام تر علمائے حق کے سر ہے۔

"تحریک ریشمی رومال" کی کامیابی اپنوں کی متوقع غداری اور انگریزوں کے طے شدہ حفظ ماتقدم کے باوجود یقینی تھی۔ کیونکہ بیرونی امداد کے امکانات دسترس میں تھے۔ ۱۸۵۸ء میں سامراجیت کی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ سے براہ راست حکومت برطانیہ کے ہاتھ میں منتقلی کے بعد خارجی انگریز دشمنی کے دور کا آغاز ہو چلا تھا۔ بعید نہ تھا کہ یہ خارجی نیک فال داخلی جد و جہد کیلئے ممد و معاون ثابت ہوتا۔ برطانیہ کی توسیع پسندی کے پیش نظر ۱۸۵۸ء میں دوآف بھوٹان پر قبضہ کیا گیا۔ اور برما کے شمالی حصے کو فتح کر کے سلطنت میں شامل کیا گیا۔ ۱۸۶۸ء میں تبت اور چین پر حملہ کیا گیا

اور سرحد کے مجاہدین پر فوج کشی ہوئی۔ ۱۸۸۵ء میں کابل پر حملہ کیا گیا۔ ۱۸۹۰ء میں منی پور پر تسلط حاصل کیا گیا۔ ۱۸۹۵ء میں چترال پر قبضہ ہوا۔ ۱۸۹۶ء میں تیراہ پر حملہ کیا گیا۔ ۱۸۹۷ء میں دوبارہ سرحدی مجاہدین کے خلاف چھ مہمیں بھیجی گئیں۔

بیرونی امداد کے سلسلہ میں ترک حکمرانوں سے توقع کسی خوش فہمی کی بناء پر نہیں تھی اس کے پس منظر میں ٹھوس حقائق اور دلائل تھے۔ ترکی، برطانیہ کا زخم خوردہ تھا۔ اگر مذہب اور حریت پسندی ہندوستان اور ترکی میں قدر مشترک نہ ہوتی، تب بھی سیاسی طور پر ترکی کی طرف سے مدد لازمی تھی۔ ۱۸۳۹ء میں انگریزوں نے سلطان عبدالمجید خان کو محمد علی پاشا کی بغاوت کے خلاف مدد دی۔ اور اس کے عوض پہلے عدن کی بندرگاہ اور پھر سارے عدن پر قبضہ کر لیا۔ اس قبضے کی وجہ سے آنے والے برسوں میں جو نتائج نکلے وہ تصوّر میں لائے جا سکتے ہیں۔ اس مدد کا سارا خرچ (بیس لاکھ پونڈ) ہندوستان کے ذمے قرض کے طور ڈالا گیا۔ ۱۸۷۸ء میں باب علی سلطان عبدالمجید خان سے خفیہ معاہدہ کر کے جزیرہ قبرص قبضے میں لے لیا گیا۔ اس کے بعد بھی دور رس نتائج نکلے۔ اس سال برلن میں یورپی ملکوں کی کانفرنس ہوئی۔ جس میں ترکی کے حصے بخرے کر کے آپس میں بانٹ لئے گئے۔ برطانیہ بھی حصہ دار بنا۔ ۱۸۵۸ء میں رومانیہ، بلغاریہ، کریٹ، سرویا، ولاشیا، ایبی سینیا، مونٹی نیگرو اور ارضی گونیا کو ترکی کے قبضے سے نکلوا دیا۔ ۱۹۰۴ء میں برطانیہ کی شہ پر فرانس نے مراکش پر قبضہ کر لیا۔

۱۹۰۸ء میں ترکی میں فوجی انقلاب رونما ہوا۔ یہ انقلاب نوجوں کی تنظیم "اتحاد المسلمین" نے برپا کیا تھا۔ جس کے قائد غازی انور پاشا تھے۔ بعد میں یہی حکومت کے سربراہ بنے۔ ۱۹۱۲ء کی جنگ بلقان میں ہندوستان کی حریت پسند تحریکوں نے ترکی کی جو اخلاقی اور مالی مدد کی تھی، اسے انور پاشا بھولے نہیں تھے۔ اس لئے

"تحریک ریشمی رومال" کو ترکی کے سربراہ کی حیثیت سے اس کی مدد غیر متوقع نہیں تھی ہندو اور مسلمان حریت پسندوں میں ذہنی ہم آہنگی اور اشتراک عمل کا جذبہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے وقت سے ہی پیدا ہو چکا تھا۔ اور اس کا ایک سے زائد بار مظاہرہ ۱۸۵۷ء میں اور اس کے بعد ہو چکا تھا۔ تحریک کے عملی قائد شیخ الہند مولینا محمود الحسنؒ۔ راجہ مہندر پرتاب اور مولینا محمد اسحٰق مانسہروی تھے اس تحریک کی مرکزی امارت تین افراد کی مرکزی کونسل کے سپرد تھی۔ اور یہی حضرات مقامی مرکزی طاقت اور مرکزی امیر تھے۔ لیکن اس کے قیام اور مرکزی منصوبہ بندی میں جن شخصیتوں کا ہاتھ تھا۔ ان میں مولینا محمد علی جوہر، مولینا شوکت علی، مولینا ابوالکلام آزاد، مولینا عبید اللہ سندھی، مسٹر گاندھی، ڈاکٹر انصاری، موتی لال نہرو، لالہ لاجپت رائے اور راجندر پرشاد شامل تھے۔ اس کے علاوہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے اعلیٰ تعلیمیافتہ نوجوانوں کی کھیپ پیدا کر دی۔ جن کے دلوں میں حریت کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں۔ اور ذہن جدید تقاضوں سے روشن تھے۔ ان نوجوانوں میں پروفیسر برکت اللہ ایم اے (انگریزی) تھے۔ جنہیں ترکی، جرمن اور جاپانی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ چوہدری رحمت علی گریجویٹ لالہ ہردیال ایم اے کامریڈ متھرا سنگھ بی اے، مولوی محمد علی قصوری بی اے۔ میاں عبدالباری ایم اے رام چندر بی اے۔ بمبئی کے شیخ محمد ابراہیم ایم اے اور چینی زبان کے ماہر بنگال کے شوکت علی بی اے وغیرہ شامل تھے۔ اس انقلابی تحریک کا ہیڈ کوارٹر دہلی بنایا گیا۔ بیرون ملک سے ملنے والی امداد کا مرکز کابل تھا۔ جس کے سربراہ راجہ مہندر پرتاب تھے۔ بعد میں مولینا عبید اللہ سندھی ان سے جا ملے۔ اور دونوں نے مل کر کام کیا۔ اس ہیڈ کوارٹر کی شاخیں مدینہ منورہ، برلن، استنبول، انقرہ اور قسطنطنیہ میں تھیں۔ اور اس تحریک کا بنیادی مقصد ممالک اسلامیہ کے تعاون

سے آزاد فضاؤں کو مقید کرنے والوں کو ہندوستان سے نکالنا تھا۔ ترکی اور افغانستان سے خفیہ معاہدہ ہوا۔ مولینا عبیداللہ سندھی اور نصراللہ خان نے ایک ماہر کاریگر سے معاہدے کی ساری عبارت جو عربی میں تھی ایک ریشمی رومال پر کڑھوالی۔ اس میں حبیب اللہ خان اور اس کے تینوں بیٹوں کے دستخط بھی آ گئے۔ رومال کی لمبائی چوڑائی ایک مربع گز تھی۔ رومال کا رنگ زرد تھا۔ اس پر زرد رنگ سے چاروں کے دستخط دوبارہ کروائے گئے۔

بیرونی حملے اور اندرونی بغاوت کیلئے ۱۹ فروری ۱۹۱۷ء کی تاریخ مقرر ہوئی۔ شیخ الہندؒ نے اپنی جائداد شرعی قانون کے مطابق تقسیم کر دی۔ اور حج کے ارادے سے مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ اس وقت حجاز ترکی کے زیر کمان تھا۔ وہاں کے گورنر "غالب پاشا" انقلابی تحریک کے ہمنوا تھے وہ صدر جمہوریہ ترکیہ انور پاشا کی جنگی کمیٹی کے سیکرٹری تھے۔ شیخ الہندؒ نے ان سے دو تحریریں لیں۔ ایک میں جہاد کی ترغیب تھی۔ اسے چھپوا کر ہندوستان اور افغانستان میں تقسیم کرانا تھا۔ دوسری تحریر حکومت افغانستان کے نام تھی۔ کہ شیخ الہند کچھ بھی کہیں اسے ہماری تائید حاصل ہے۔ انگریزوں نے پہلی تحریر کو غالب نامہ کہا۔ اسی بناء پر بعد میں غالب پاشا کو گرفتار کر کے جنگی قیدی رکھا گیا۔ انہوں نے بھی اپنی پہلی تحریر کا اقرار کیا دوسری کا نام تک نہ لیا۔ بہر کیف پروگرام کے مطابق حملے کیلئے چار محاذ بنائے گئے۔ ہر محاذ پہ ایک انقلابی کو نگران مقرر کیا گیا۔

۱۔ مولینا محمد صادق کی نگرانی میں قلات اور مکران کے قبائل کا ترک فوج کی قیادت میں کراچی پر حملہ

۲۔ حافظ تاج محمود سندھی کی نگرانی میں ترک فوج کی سربراہی میں غزنی اور قندھار کے قبائل کا کوئٹہ پہ حملہ۔

۳۔ درۂ خیبر کے راستے پشاور پر مہمند اور مسعود قبائل کا ترک فوج کی قیادت میں حملہ۔ نگران حاجی ترنگ زئی تھے۔

۴۔ اوگی کے محاذ پر ترک فوج کا کوہستانی قبائل کو لے کر حملہ۔ نگران مولینا محمد اسحٰق مانسہروی تھے۔

پروگرام یہ تھا کہ رومال حیدر آباد میں شیخ عبدالرحیم کو پہنچایا جائیگا۔ جو اسے لے کر حج کو جائینگے اور شیخ الہندؒ کے حوالے کریں گے۔ اور ترکی افغانستان کے راستے مقررہ تاریخ پر ہندوستان پر حملہ کر دے گا۔ جب مولینا عبیداللہ سندھی سے بنارس کے نومسلم گریجویٹ شیخ عبدالحق نے ریشمی رومال لے کر پشاور میں حق نواز خان کو پہنچایا۔ تو انہوں نے اسے صبح چار بجے ایک خاص آدمی کے ہاتھ بہاولپور کے مقام دین پور میں سجادہ نشین خواجہ غلام محمد کو بھجوا دیا۔ انہوں نے ایک آدمی کے ذریعے یہ امانت حیدر آباد میں شیخ عبدالرحیم کو پہنچائی۔ سی آئی ڈی اور فوج تعاقب میں تھی۔ جملہ حضرات یکے بعد دیگرے فوج نے چھاپہ مار کر گرفتار کر لئے۔ ریشمی رومال دوسرے دن دوپہر کو حیدر آباد میں شیخ عبدالرحیم کو ملا۔ اور عشاء کے وقت جب وہ اسے گدڑی میں سی رہے تھے تو یہ فوج کے ہتھے چڑھ گیا۔ قبل از وقت راز فاش ہو جانے سے تحریک ناکام ہو گئی۔ بعد میں سی آئی ڈی کی سب اطلاعات کی تصدیق ہو گئی۔ انہوں نے داخلی طور پر یہ فوری قدم کیا۔ کہ ہر اس مقام پر فوج بھیج دی۔ جہاں بغاوت کا خطرہ تھا۔ شمال مغربی سرحد پر فوج کی تعداد دگنی کر دی۔ اور ساتھ ہی ملک بھر میں انقلابیوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔ مولینا حسین احمد مدنیؒ مولینا عزیز گل اور مولینا وحید الزمان گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیئے (مولینا وحید الزمان وہیں فوت ہوئے)۔ شیخ الہندؒ کو مکہ معظمہ سے گرفتار کر کے جزیرہ مالٹا بھیج دیا گیا۔ مولینا تاج محمد امروٹی، مولینا ابوسراج، غلام محمد بہاولپوری

ریشمی رومال کی عبارت سے انقلابیوں کے ارادوں کی تصدیق ہو گئی

مولینا ابراہیم کمادی (شورت)، مولینا شیخ ریاض احمد (ڈھاکہ) اور مولینا محمد اسحٰق مانسہروی راولپنڈی نظربند کر دیئے گئے۔ جس شخص پر ذرا سا بھی شبہ گزرا۔ اُسے گرفتار کرلیا گیا۔ گرفتار شدگان پر طرح طرح کی سختیاں کی گئیں۔ دو چار کے سوا سب ہی ثابت قدم رہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی طرح اب بھی قیادت علمائے کی تھی۔ شاید تاریخ اپنے آپ کو دوہرا رہی تھی۔

خارجی طور پر برطانیہ نے سب سے پہلے ترکی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اور ترکی کی ہر سرحد پر محاذ کھول دیئے۔ ایران میں فوج داخل کر کے ترکی اور افغانستان کے درمیان حد بندی کر دی گئی۔ سب سے بڑا انتقام یہ لیا کہ شریف مکہ کو آلہ کار بنا کر اس سے ترکی کے خلاف بغاوت کرا دی۔ عرب قومیت کا پرفریب نعرہ یہیں سے بلند ہوا۔ اس کے علاوہ عرب اور ہندوستان کے زرخرید مولویوں سے ترکوں کے خلاف فتوے دلوائے۔

ریشمی رومال کے متعلق مولینا عبید اللہ سندھی کا خیال تھا کہ پشاور کے حق نواز خان نے مخبری کی لیکن مولینا حسین احمد مدنی کو اس سے اختلاف تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ حبیب اللہ خان اور اس کا لڑکا عنایت اللہ خان "تحریک ریشمی رومال" کی سرگرمیوں کی باقاعدہ رپورٹ انگریزوں کو پہنچاتے تھے۔ ان لوگوں کی متلون مزاجی اور غدار فطرت کے سبب یہ بات خارج از امکان نہیں۔ غداری کے سلسلے میں تحریک کے اکثر کارکنوں کا اتفاق ہے کہ انگریزوں کے جاسوس مجاہدین کے روپ میں گھس گئے تھے بعض افراد نے جان بچانے کیلئے بھی راز اگل دیئے۔ جاسوسوں میں سرفہرست مولینا عزیز گل کو بتایا جاتا ہے۔ مولینا چاندپوری، ایک خطیب عیدگاہ دیوبند، ایک قندھاری مولوی صاحب بھی اسی فہرست میں ہیں۔ حضرت شیخ الہند فرمایا کرتے تھے۔

سخن از بیگانگاں ہرگز نہ نالم

کہ با من کرد آں چہ آشنا کرد

"تحریک ریشمی رومال" کی ناکامی کے بعد خلافت کی انقلاب آخریں تحریک اٹھی۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ نہ صرف برصغیر ہندوپاک بلکہ اسلامی ممالک میں بھی بہت جلد مقبول ہوئی۔ مگر ترکی کے انقلاب اور ہندو ذہن کی عیاریوں نے اس کی جڑیں ہلا دیں۔ تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں۔ کہ برصغیر میں آزادی کی منزل کو قریب تر لانے میں "تحریک خلافت نے بھی اہم کردار ادا کیا۔
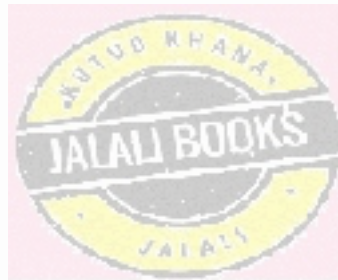
تحریکِ خلافت

ضلع ہزارہ کیلئے مالکِ کون و مکان کا یہ فیصلہ تھا کہ اس کی بنجر و بیاباں مٹی مختلف ادوار میں مختلف تہذیبوں اور مختلف تحریکوں کے قافلہ کی منزل بنی رہے۔

۱۹۱۱ء میں شمال مغربی ہندوستان کی مقتدر شخصیت حاجی علی گوہر خان رئیس تاتار[1] (TATAR) (علاقہ پکھل ہزارہ) نے غلام آباد ہند کے سیاسی اتار چڑھاؤ پر نگاہ ڈالی کہ مسلمانان ہند خلافت عثمانیہ کو اپنی متاعِ بے بہا سمجھتے تھے۔ جسے مغربی حکومتیں ختم کرنے کے درپے تھیں۔ اسی سبب سے مسلمانوں میں سیاسی بیداری کی لہر اٹھی۔ فرزندان توحید اسلام کی نشاۃ ثانیہ کیلئے مضطرب ہوئے۔ اور یہ احساس ہمہ گیر صورت اختیار کرنے لگا۔ صاحب موصوف کو خیال آیا کیوں نہ اس قوم کیلئے ایک راستہ متعین کیا جائے۔ جو آزادی ہند کیلئے بھی نشان راہ ثابت ہو۔ انہوں نے فکری پیاس کی شدت محسوس کی اور اس اہم ضرورت کے متعلق اپنے معتمد خصوصی احمد خان سے تبادلۂ خیالات کیا۔ وہ تاتار کے قریب ہی بیرال نامی گاؤں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان سے دوستانہ مراسم کے علاوہ خاندانی قرابت بھی۔ علمی اور سیاسی لحاظ سے احمد خان علاقہ پکھل میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ چنانچہ طویل گفت و شنید کے بعد احمد خان نے "انجمن اسلامیہ پکھلی" کا خاکہ پیش کیا کہ یہاں ایک مذہبی یونیورسٹی کا قیام نہایت ضروری ہے۔ جس کی

---

[1] حاجی علی گوہر خان رئیس تاتار کی تاریخ پیدائش ۲۱ر جولائی بروز جمعہ ۱۸۶۲ء کو اور تاریخ وفات ۲۲ر فروری بروز اتوار ۱۹۵۸ء ہے

ابتداء پرائمری مدرسہ سے کی جائے۔ جو آنے والی نسلوں کیلئے مشعلِ راہ ہو۔ اور انجمن ممد و معاون کی حیثیت میں سرپرستی کرے۔ چنانچہ سرزمین ہزارہ کی آبیاری کیلئے احمد خان نے "انجمن اسلامیہ پکھلی" کی بنیاد ڈالی۔ اور حسنِ اتفاق سے سب سے پہلا صدر احمد خان مرحوم ہی کو چنا گیا۔ اور جنرل سیکرٹری کے فرائض حاجی علی گوہر خان کو سونپ دیئے گئے۔ جائنٹ سیکرٹری حاجی گلاب خان۔ نائب صدر خادی خان بابا (ملک پور)۔ خزانچی مولوی سید حسن صاحب منتخب ہوئے۔ ارکان مجلس عاملہ غلام ربانی خان بی اے ایل ایل بی مانسہرہ۔ علی اصغر خان وکیل سکونتی سفیدہ۔ قاضی عبداللہ وکیل مانسہرہ۔ غلام رسول خان و غلام ربانی خان ساکنان سفیدہ۔ سمندر خان۔ غلام ربانی دلازاک۔ میرزمان خان عرائض نویس ساکنان مانسہرہ قرار پائے۔ بایں ہمہ اس انجمن کی سرپرستی میں "اسلامیہ پرائمری سکول" بمقام بفہ (BAFFA) قائم کیا گیا۔ اور ایک بڑی لائبریری کی بنیاد رکھی گئی۔ ابتداء میں اس مدرسہ کا نصاب "انجمن حمایت اسلام" کے نمونہ پر تھا۔ اس انجمن کی فلاح و بہبود کیلئے والیئے امب نواب خانیزمان خان نے دو ہزار روپے نقد پیش کئے۔ اور مستقل اعانت کیلئے چھ سو روپیہ سالانہ دینے کا وعدہ کیا۔ حاجی علی گوھر خان نے اسے کامیاب بنانے کیلئے ہندوستان کے اطراف و اکناف میں مختلف شخصیتوں سے رابطہ قائم کیا۔ اسی سفر کے دوران میں خواجہ حسن نظامی۔ اکبر الہ آبادی اور وائس چانسلر علیگڑھ یونیورسٹی سے تبادلۂ خیالات کیا۔ انہوں نے اس کام کو بے حد سراہا۔ اور اس وقت کی مشہور و معروف شخصیتوں کو "بنجر آباد" زمین سے ابھرنے والی تحریک سے والہانہ شغف ہو گیا۔ حکیم الامت علامہ اقبال اور مولانا ظفر علیخان جیسی ہستیوں کی توجہ اس جانب مبذول ہوئی۔ درحقیقت "انجمن اسلامیہ پکھلی" کا قیام "تحریکِ خلافت" کیلئے دعوت کا پیام تھا۔ اور ان میں اکثر حضرات

"تحریک خلافت" کے پلیٹ فارم پر پیش پیش رہے۔ یہ انجمن احمد خان کی عملی کاوشوں اور حاجی علی گوھر خان کی بے پناہ کوششوں سے دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کر رہی تھی۔ ابھی منزل شباب میں قدم رکھنے والی تھی کہ مطلع سیاست پر جنگ کے بادل چھاگئے۔ باشندگان ملک کی تمام تر توجہ ان حالات کی طرف منعطف ہوئی۔ اگرچہ خلافتِ عثمانیہ کے سبب مسلمان قدرے بیدار ہو چکے تھے اچانک ہندوستان کے دوسرے کونے سے ایک تحریک اٹھی۔ بقول نصراللہ خان عزیز

"یکایک کلکتہ سے ایک رعد سا صدا بلند ہوئی جو تمام ہندوستان میں گونجی اور مدہوشوں کو ہوشمند اور سوئے ہوؤں کو بیدار کر گئی۔ یہ صدا ایک گمنام مجاہد کے ہونٹوں سے بلند ہوئی جو زبان اور قلم کی حیرت انگیز خداداد طوفان انگیزیوں کے ساتھ ہندوستان کے شہر خموشاں پر چھاگیا اور پورا ملک حیرت و استعجاب کے عالم میں اپنے دل سے سوال کرنے لگا کہ بیسویں صدی میں قم باذن اللہ کون پکار اٹھا۔ یہ ابوالکلام مدیر ہلال کون ہے؟ جس کے کلام میں جادو، زباں میں سحر اور تحریر میں اعجاز ہے جو زبان کی کاٹ سے غافل دلوں کی بستیوں کو الٹ دیتا ہے۔ اور بھولے ہوئے حق کی طرف اس قوتِ اعجاز سے بلاتا ہے کہ جو اس کی بات سمجھتا ہے۔ وہ دیوانہ وار اس کی طرف دوڑتا ہے۔ اور جو نہیں سمجھتا۔ وہ بھی مبہوت ہو کر ادھر کی راہ لیتا ہے۔"

اس وقت بعینہٖ شمال مغربی ہندوستان کی "بنجر آباد" سرزمین میں ایک سیلاب مانسہرہ کے قدیمی اور تاریخی شہر میں اٹھا۔ جس نے برصغیر کو اپنی موجوں سے سیراب کر دیا۔ یا وہ ایک برق تپاں تھی۔ جس نے یکایک بجلی کے کڑکے کی طرح تمام ہندوستان کو ہلا دیا۔ کہ مسلمانان ساحر فرنگ سے شکست کھا کر اپنی منزل

کو فراموش کر چکے تھے وہ مجاہد مولینا محمد اسحٰق اور مولینا ابو المعارف محمد عرفان تھے جن کی سحر طرازی اور ان کے چھوڑے ہوئے تاثرات سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ کہ یہ دونوں دل و دماغ کی مملکت کے تاجدار تھے۔ مولینا محمد عرفان کے جواہر نگار قلم اور مولینا محمد اسحٰق کی گوہر بار زبان سے نکلے ہوئے موتیوں نے باشندگان ضلع ہزارہ کو ایسا مسحور کیا کہ عوام الناس شمع صداقت پر جلنے کیلئے مردانہ وار بڑھنے لگے۔ استدلال کی پختگی، زبان کی لطافت، الفاظ کی شوکت اور انداز بیان کی پاکیزگی، دل و دماغ، عقل و جذبات دونوں کو یکساں مسخر کرتی جا رہی تھیں۔ بالآخر اسی سیلاب نے تمام ہندوستان کو اپنی موجوں کی لپیٹ میں لے لیا۔ اور ساکنان ہند محسوس کرنے لگے۔ کہ تحریک خلافت ہندوستان کی آزادی کی تحریک ہے۔

"میرے دوستو! وہ مال کی قربانی ہے جس کیلئے تمہیں تیرہ سو برس سے پکارا جاتا ہے کہ اپنی جان اور مال کو سچائی کی راہ میں قربان کرو۔ مگر آج مسلمانوں کے بس اتنا نہیں کہ وہ سمرنا پہنچیں، اور دشمنان اسلام کے مقابلہ میں اپنی لاشیں تڑپائیں۔ اگر آج مسلمانوں کی قسمت میں یہ دولت نہیں لکھی تو کتنے افسوس کی بات ہے۔ کہ وہاں کے مسلمان بھائیوں کی روپیہ سے بھی مدد نہ کریں۔ ہندوستان کا کوئی مسلمان اپنے آپ کو مسلمان محسوس کا حق نہیں رکھتا جب تک وہ زیادہ سے زیادہ اپنے مال کو آج حکومت انگورہ (انقرہ) اور مجاہدین انگورہ (انقرہ) کیلئے قربان نہ کردے۔"

اس الہامی آواز نے ضلع ہزارہ کو بھی خواب غفلت سے بیدار کر دیا۔ کوہستان ہزارہ کے کونے کونے سے تحریک خلافت کی تائید میں آوازیں بلند ہونے لگیں۔ تحصیل مانسہرہ کا علاقہ انگریزی حکومت سے بغاوت پر آمادہ ہو گیا جب مانسہرہ شہر میں

تحریک خلافت کے زیر اہتمام جلسہ منعقد ہوتا تو ہزاروں کی تعداد میں لوگ شرکت کرتے اور اس جلسہ کی شمولیت کو مذہبی فریضہ خیال کیا جاتا جس میں یہ مطالبہ کیا جاتا کہ خلافت عثمانیہ کو بحال کیا جائے حکومت انگریزی میں نوکری کرنا اور اس کی واسطہ یا بلاواسطہ تابعداری یا تائید کرنا مسلمان پر قطعاً حرام ہے۔ اور اسے امدادی چندہ دینا بھی خلافِ شریعت ہے۔ ان تاثرات کے باعث تحصیل مانسہرہ کے نمبرداران کی انجمن پہلی بار معرض وجود میں آئی۔ تقریباً ایک سو چالیس نمبردار حضرت مولینا محمد اسحٰق کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اپنے مناصب سے مستعفی ہو گئے۔ گورنمنٹ کے ملازمین پہ اثر ہونا قدرتی امر تھا۔ چنانچہ شیخ احمد[1] خان پٹواری تحصیل مانسہرہ جو کہ حدو باندی گاؤں سے تعلق رکھتے تھے حضرت مولینا محمد اسحٰق اور مولینا ابوالمعارف محمد عرفان کے حلقۂ احباب میں تھے۔ ان کی تحریک پر پٹواریان مالی نے حرارت محسوس کی محمد عمر خان پٹواری سکونتی کو ٹلی بھی اس کام میں پیش پیش رہے۔ ان ہردو ملازمین نے اہم کردار ادا کیا جس کے باعث تحصیل مانسہرہ سے مولوی غلام حسین پٹواری سکونتی بفہ۔ خستہ خان اور

---

[1] شیخ احمد خان پٹواری کے دوستانہ مراسم کے علاوہ ابوالمعارف مولینا محمد عرفان سے خاندانی قرابت بھی تھی۔ شیخ احمد خان پٹواری کے چار اور حقیقی بھائی بھی تھے محمد گل، برکت اللہ، محمد امیر پٹواری سید احمد تھے محمد گل سے مولوی میر عالم عرائض نویس اور غلام جان خان ریٹائرڈ رجسٹرار کو اپریٹو ڈیپارٹمنٹ مغربی پاکستان اور محمد جان فرسٹ انڈین ایس ایس پی ملائشیا متوفی ۱۹۱۵ء فیض عالم اور عبدالرحمٰن حمید اور دوسرے بھائی برکت اللہ کی اولاد مقبول الرحمٰن، شفیق الرحمٰن اور جمعدار محمد سرور بانی جماعت اسلامی ضلع ہزارہ ہیں۔ اور شیخ احمد خان پٹواری کی اولاد سے حاجی غلام ربانی خان، مظفر حسین خان پنشنر سب انسپکٹر پولیس اور حبیب الرحمٰن خان پنشنر اے ایس آئی پولیس اور خلیل الرحمٰن خان سیکرٹری لوکل باڈیز میں لیکن محمد امیر اور سید احمد کی کوئی نرینہ اولاد نہیں ہے۔

عطا محمد خان پٹواریان ساکنان بالاکوٹ تحصیل ایبٹ آباد سے فضل احمد خان، عزیز خان غلام حیدر خان پٹواریان ساکنان نواں شہر، ولی محمد خان پٹواری سکونتی کاکول، عبدالعزیز فاروقی اور برادرش حقیقی شاہ زمان خان سکونتی جرل، سید سعادت شاہ پٹواری سکونتی بفہ (تحصیل مانسہرہ) تحصیل ہری پور سے حسین بخش پٹواری سکونتی سریہ، اور عبدالجبار خان پٹواری سکونتی پانڈک قابل ذکر حضرات ہیں۔ محکمہ تعلیم میں سب سے اول ماسٹر حبیب اللہ خان سکونتی تاجل (علاقہ پکھل) نے ملازمت سے استعفےٰ دیدیا دیگر محکمہ جات کے ملازمین نے بھی یکے بعد دیگرے استعفےٰ جات پیش کئے۔

یکم اگست ۱۹۲۰ء کو تمام ہندوستان میں ہمہ گیر ہڑتال ہوئی۔ اسی اثناء میں اہالیان پکھل نے قائدین خلافت حضرت مولینا محمد اسحٰقؒ اور مولینا ابوالمعارف محمد عرفان کو ۱۱ اگست ۱۹۲۰ء کو ڈھوڈیال شہر میں جلسہ کی دعوت دی۔ جس میں انہوں نے شرکت کی۔ اور باشندگان پکھل کو حکومت برطانیہ کا بائیکاٹ کرنے کی دعوت دی۔

مقاصد جلسہ بیان کرنے کے بعد جہاد کیلئے چندہ کی اپیل کی تو ہر ایک نے والہانہ انداز میں گھر کا سب کچھ لٹا دیا۔ مستورات نے اپنے زیور اور نقدی چندہ میں دیئے۔ اس جلسہ کے اختتام پر دوسرے دن کیلئے اہالیان بفہ نے قائدین خلافت کو مدعو کیا۔ چنانچہ دوسرے روز مولینا محمد اسحٰقؒ اور ابوالمعارف محمد عرفان ڈھوڈیال سے روانہ ہو کر بفہ کے مشہور و معروف شہر میں پہنچے۔

بفہ کے تاریخی شہر میں صاحبزادہ طوطی گل کی مسجد میں تحریک خلافت کے مقاصد سے عوام کو روشناس کیا۔ اور غلام حیدر خان خواجہ خیلی کے حجرہ میں قیام کیا۔ ہندوؤں نے بطور تحفہ مٹھائی اور مصری کے چالیس پچاس تھال پیش کئے۔

تیسرے دن اہالیان خاکی نے مولینا موصوف کو دعوت دی۔ اور عظیم الشان اجلاس کا اہتمام کیا۔ یہ اجلاس نہایت اہم اور تاریخی نوعیت کا تھا۔ جونہی قائدین خلافت

تیسرے روز بفہ سے جلوس کی صورت میں نکلے تو ایک حصہ جلوس خاکی پہنچ چکا تھا دوسرا حصہ گلی باغ سے گزر رہا تھا تقریباً سات میل لمبا جلوس جس کے ساتھ ساتھ ۱۵۰ جھنڈے اور بعض گھڑ سوار تھے جلوس ترنگڑی، صابر شاہ، ملک پور، شیرپور، خواجگان سے ہوتا ہوا جلسہ گاہ بمقام خاکی پر ختم ہوا۔ راستے میں ہر شہر کے مرد و زن والہانہ اشتیاق سے استقبال کیلئے کھڑے تھے مشروبات وغیرہ سے جلوس کی تواضع کی گئی۔
عظیم الشان انبوہ کی قیادت مجاہد ملت حضرت مولانا محمد اسحٰق مانسہروی کر رہے تھے اس وقت تحصیل مانسہرہ میں تحریک خلافت کے خلاف محمد حسین خان مخبری کے فرائض سرانجام دے رہا تھا اس نے چیف کمشنر گرانٹ کو ڈاک بنگلہ مانسہرہ سے موقعہ ملاحظہ کرا کے اپنی خدمات خلاف مذہب و ملت کا ثبوت دیا، اور جعفر بنگال و صادق دکن کی روایات کا پیرو بن کر حاکمانِ وقت کی خوشنودی حاصل کی۔ اس کے ہم مسلک حواری بھی اپنی تگ و دو میں مصروف رہے۔ مردانِ حق کے آگے اس قسم کی فریب کاریاں اور کذب و افتراء کے جال کب حائل ہو سکتے تھے مجاہد ملت مولانا محمد اسحٰق اور رئیس الاحرار مولانا ابوالمعارف محمد عرفان کی مساعی جمیلہ کے باعث تحریک خلافت کا طوفان برپا ہو چکا تھا اور حاجی علی گوہر خان رئیس تناول اور ان کے رفقاء کی مخلصانہ کوششوں سے تحریک علاقہ پکھل میں کافی زور پکڑ چکی تھی۔ اس ابھرتی ہوئی تحریک کو دیکھ کر ریاست تناول و پھلڑہ کے عوام مجنونانہ انداز میں بڑھنے لگے۔ اس علاقہ کے لوگوں نے اپنے وفد کے ذریعے مولانا محمد اسحٰق اور مولانا ابوالمعارف محمد عرفان کو یقین دلایا کہ ہم بمقام ڈب (مانسہرہ) میں ایک فیصلہ کی تجویز پر عمل پیرا ہونے کو تیار ہیں۔ اگر جہاد مطلوب ہے۔ تو تمام قوم تنولی بمقام ڈب اور چھتی ڈھیری کے درمیان ایک الوداعی خطبۂ جہاد سن کر اسی دن مصروفِ عمل ہو جائینگے۔ ان مقاصد کے پیش نظر خاکی کے تاریخی عظیم الشان اجلاس کے اختتام پر ایک ایسا انتظام کیا گیا کہ مانسہرہ سے کاغان، بٹل سے بگرام،

اوگی، تناول، امب دربند، کھلابٹ، کوٹ نجیب اللہ، خانپور، گندگر، سریکوٹ، ہری پور، لورہ، ایبٹ آباد، گلیات الغرض تمام ضلع ہزارہ ایک آواز منزل بہ منزل سنائی گئی۔ کہ مانسہرہ میں حکومت برطانیہ کے خلاف بروز جمعہ مجاہد ملت مولانا محمد اسحٰقؒ اعلان جہاد فرمائینگے اگر انہیں گرفتار کیا گیا، تو اس کی خاطر ہر قسم کی قربانی دی جائیگی۔

حکومت بھی ان حالات سے بے خبر نہ تھی، کہ جمعہ کے روز ایک عظیم الشان انقلابی اجلاس ہو رہا ہے۔ چنانچہ حاکمانِ وقت نے حفاظتی تدابیر بروئے کار لاتے ہوئے بھبیڑہ پہاڑ کی چوٹی پر نوگزی کے متصل ایک مورچہ بنوا کر توپ خانہ نصب کرا دیا۔ اور ڈاک بنگلہ کے قریب بلند ٹیلوں اور شہر کے ارد گرد بلند مقام پر گورکھا فوج متعین کر دی۔ تاکہ بوقتِ ضرورت مشین گنوں کے ذریعے انبوہِ کثیر کو ہلاک کیا جا سکے۔ یہ تمام سکیم مخبرانِ خلافت کے گروہ کی بتلائی ہوئی تھی۔ گویا غداران ملت اسلامیہ کی عزت و ناموس کا جنازہ دیکھنے کیلئے منتظر تھے۔ چیف کمشنر اور دیگر اعلیٰ افسران کو ڈاک بنگلہ کی پہاڑی پر لمحہ بہ لمحہ خبر رسانی کر کے اپنی وفاداری و جاں نثاری جتلا رہے تھے۔ بعض مخلص اور سنجیدہ افراد نے مجاہد ملت مولانا محمد اسحٰقؒ کو مشورہ دیا کہ بغیر اسلحہ اور طاقت کے اعلان جہاد نہ کیا جائے۔ بلکہ منظم طور پر اس تحریک کو عالمگیر صورت میں چلایا جائے۔ ورنہ ہزاروں افراد کے ہلاک ہونے کا خدشہ ہے۔ اور ڈب کے مقام پر جلسہ اور مظاہرہ ضرور ہو، لیکن جلسہ میں نظم و ضبط برقرار رکھ کر مؤثر طور پر تحریک چلائی جائے۔

قوم فروشوں کی رسوائے زمانہ حرکات کو دیکھ کر مولانا محمد اسحٰقؒ نے جلسہ عام میں جامع مسجد میں یہ کہنا پڑا کہ

"ملتِ اسلامیہ کے خلاف سازش کرنے والا شخص مسلمان نہیں ہو سکتا میں ہر غدار کو کافر کہتا ہوں۔ دیکھئے! آج وفادارانِ برطانیہ کی خوشنودی

کیلئے محمد حسین خان جاسوسی کے فرائض سرانجام دے رہا ہے۔"

جمعہ کے روز مقررہ تاریخ پر بمقام ڈب لاکھوں افراد جمع ہوئے۔ مولینا موصوف نے گھوڑی پر سوار ہوکر صفیں درست کیں۔ اور نماز جمعہ کا خطبہ گھوڑی پر بیٹھ کر سنایا۔ جس کو دیکھ کر حج بیت اللہ کا نظارہ یاد آتا تھا۔ اس زمانہ میں لاؤڈ اسپیکر کا رواج نہیں تھا۔ مولینا صاحب نے یہ تجویز پیش کی۔ کہ فی الحال جہاد کی اجازت شرعاً نہیں دی جاسکتی۔ صرف تحریک جاری رہیگی۔ باشندگان تناول جوش جہاد سے پشاہرہ آئے ہوئے تھے۔ ان کے جنون کا یہ عالم تھا۔ کہ سرپر کفن، تلواریں نیام سے باہر بیخودی کے عالم میں رقص جہاد کرتے چلے آرہے تھے۔ مولینا کی تجاویز سے لوگوں کا جوش قدرے نرم ہوگیا۔ اس کے باوجود ریاست تناول کے باشندگان نے قاضی محمد شاہ کو جو اغلباً چورکلاں کا رہنے والا تھا جہاد کیلئے اپنا امیر منتخب کر لیا اور گھوڑے پر سوار کراکے سُرمہ وغیرہ لگاکر سب نے مبارکباد دی۔ ان کی اکثریت مولینا محمد اسحٰقؒ کے تابع تھی۔ جب سائیں کالو کے قبرستان کی طرف نوہار باندھ کے رُخ قوم تنولی کا ہجوم بڑھا تو دوبارہ مولینا صاحب نے اعلان کیا۔

"میں تم کو جہاد کی اجازت شریعت کے مطابق نہیں دے سکتا"

مولینا صاحب اور دیگر زعماء نے لوگوں کو بیرون شہر جانے کی تاکید کی۔ مگر قوم تنولی کے غیور افراد شہر کے باہر بریڑی پہاڑ کے دامن میں مورچہ زن ہوگئے۔ جن کی نسبت یہ گمان ہو رہا تھا کہ اپنے اپنے گاؤں کو روانہ ہو چکے ہیں۔ ادھر جاسوسوں نے انگریزوں کو خبر کردی۔ کہ قوم تنولی کے سرفروش پہاڑ کے دامن میں چھپ کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور رات کو شبخون مارنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ مخبران یہ جانتے تھے کہ اگر رات کو ہنگامہ نہ ہوا۔ تو ان کی اطلاع غلط ثابت ہوجائے گی۔ اور حکومت کا ان پر اعتماد ختم ہوجائے گا۔

اور ان کے انعام و اکرام میں کمی واقع ہو گی اور وہ حکمران وقت کی نوازشات سے یکسر محروم ہو جائیں گے۔

وہ ساون کا مہینہ تھا کھیتوں میں مکی کے لمبے لمبے پودے کھڑے تھے۔ جو بوقت ضرورت لشکر عظیم کیلئے پناہ گاہ کا کام دے سکتے تھے۔ مجزوں نے ایک عجیب و غریب اسکیم بنائی۔ کہ رات کو حملہ آور ہونے کا الزام لگا کر مجاہد ملت مولینا محمد اسحٰقؒ کو گرفتار کرایا جائے۔ واقعات یوں ہیں۔ کہ "وادی پکھوش" کے مشہور و معروف قدیمی شہر مانسہرہ کے ایک لوہار فقیر محمد عرف بلو کو محمد ہمایوں خان نے ایک بندوق دو نالی دے کر مشورہ دیا کہ ڈب کے قبرستان میں بارہ بجے کے قریب جا کر ہوائی فائر کر دیا جائے۔ اس وقت گورکھا فوج اور انگریز افسر شہر کے ارد گرد مورچہ زن ہو کر حالات پر قابو پانے کیلئے تدابیر سوچ رہے تھے اچانک دو فائر ہوئے اور شور و غوغا کی آواز آئی کہ تنولیوں نے شہر پر حملہ کر دیا ہے فوج نے چاروں طرف اس قدر اندھا دھند مشین گنوں سے فائر کئے کہ ٹین کی چادروں پر اولوں کی طرح گولیوں کی بارش ہو رہی تھی۔ اہل ہنود اپنے گھروں میں گھبراہٹ سے بندوق اور پستول چلا کر ہمت افزائی خود کر رہے تھے۔ اہل ہنود کی مستورات اور بچوں کی آہ و زاری سے سارا شہر افراتفری اور ماتم خانہ معلوم ہوتا تھا۔ آفتاب اپنی روشنی بکھیرنے والا تھا۔ نوید صبح کے آثار نمودار تھے کہ انیس نمبر بنگال رسالہ مجاہد ملت مولینا محمد اسحٰقؒ کی گرفتاری کے لئے بیرون شہر پہنچ چکا تھا۔ فوج نے شہر کے ارد گرد گھیرا ڈال دیا۔ فوجی بگل سے مولینا صاحب کی قیام گاہ پر حملہ کرنے کی ہدایت ہوئی۔ شہر کے گلی کوچوں میں فوجیوں کے بوٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ حملہ آور فوجیوں نے جنگی نعرہ لگا کر مولینا صاحب کی رہائش گاہ پر قبضہ کر لیا۔ دو سپاہیوں نے مکان کی چھت پر مشین گن لگا دی۔ پیدل فوج مکان میں داخل ہوئی۔ مولینا صاحب

اس وقت روٹی کھا رہے تھے۔ ان کے سینے پر پستول اور سنگین نکال کر گرفتاری کیلئے دھمکی دی۔ ایک مسلمان جاسوس غالباً ایبٹ آباد کا موچی تھا مولینا محمد اسحٰقؒ صاحب کے ہمراہ دسترخوان پر روٹی کھا رہا تھا۔ اشارہ سے اس سے اس نے پوری شناخت کرا کر گرفتاری کرائی۔ اس موقع پر انجیل مقدس کی آیت یاد آتی ہے۔ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی گرفتاری بھی اپنے ایک معتقد حواری کی رشوت خوری سے ہوئی۔ جس کی شکل و صورت مسیحؑ سے مشابہ تھی۔ اس نے کہا۔

"جس شخص کے منہ میں نوالہ ڈالا گیا وہ یسوع ہوگا ــــــــــــ "

چنانچہ یہودی حکام نے آسانی سے گرفتاری کر لی بعینہٖ مولینا صاحب سے بھی ایسی ہی نوبت آئی۔ کہ یہاں بھی حواری نے گرفتاری میں اپنا پورا حق ادا کر دیا مولینا صاحب

لہ مولینا محمد اسحٰقؒ مانسہروی خلافت کی تحریک میں ۲۸ اگست سنہ ۱۹۲۰ء کو گرفتار ہوئے۔ عرصہ تک نینی تال جیل میں بھی رہے۔ جب رہائی ہوئی تو آپ کو انگریزی حکومت نے مانسہرہ جانے نہ دیا۔ بلکہ ضلع ہزارہ میں داخلے پر پابندی لگا دی۔ آپ نے راولپنڈی کو اپنا دینی و سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ محلہ امام باڑہ میں ایک شاندار مسجد بنوائی۔ جس کا نام مسجد انگور رکھا۔ خود ہی امامت اور درس و تدریس کی زندگی اختیار کی۔ چالیس سال اسی مسجد انگور کے ایک حجرہ میں بسر کر دیئے۔ اس عرصہ میں مختلف تحریکات کے سلسلہ میں بار ہا گرفتار ہو کر قید ہوئے۔ اور رہائش کے بعد پھر اسی مسجد میں جا گزیں ہوئے سنہ ۱۹۱۹ء سے سنہ ۱۹۶۲ء تک مسلمانوں کی بے لوث خدمت کرنے کے بعد یہ مرد مجاہد ۸ دسمبر سنہ ۱۹۶۲ء کو صبح چھ بجکر دس منٹ پر اس جہانِ فانی سے رخصت ہوا۔ آپ کو اپنے آبائی گاؤں حویلیاں میں اپنے آبائی قبرستان میں آپکے بڑے بھائی حکیم خلیل احمد کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ تاریخ میں مولینا محمد اسحٰقؒ مانسہروی کی نسبت سے مشہور ہوئے۔

کے مکان کے سامنے مشین گنیں نصب تھیں۔ اور ان کا مکان ہٹلر جرمنی کا قلعہ دکھائی دے رہا تھا۔ چھ گورکھا سپاہی مولیناؒ صاحب کو پکڑے گھسیٹے جاتے تھے۔ وہ برہنہ پا و سر گرفتار کر کے سڑک پر لے گئے۔ جہاں انہیں لاری میں دھکیل دیا۔ مانسہرہ شہر میں کرفیو اور دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ تھا۔ آمد و رفت بند تھی۔ گولی چلنے کا اندیشہ تھا۔ پورے پانچ گھنٹے کے بعد جب حکومتِ وقت کا خطرناک دشمن ایبٹ آباد پہنچ چکا تھا۔ اہل ہنود اور پریشاں حال حضرات کو نجات کی کرن نظر آئی۔ مگر شیدائیان اسلام بیقراری کے عالم میں تھے۔ تاریخی لحاظ سے بھی اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا۔ مولینا محمد اسحٰقؒ صاحب کی گرفتاری جس انداز میں ہوئی۔ اسی طرح مولینا ابوالعارف محمد عرفان کو بھی گرفتار کر کے ایبٹ آباد بھیجا گیا۔ ان روایات کے برعکس اس روئیداد کے متعلق جو حالات معلوم ہوئے ان کا ذکر بھی ضروری ہے۔ تاکہ تمام پہلوؤں سے ہر ایک بخوبی واقف ہو سکے۔ درحقیقت "مانسہرہ" کی داستانِ خونچکاں "سرزمینِ بے آئین" کے عنوان سے ہی مزین ہے۔

مانسہرہ کی داستان خونچکاں

مجاہد ملت مولانا محمد اسحٰق صاحب رئیس الاحرار مولانا ابوالمعارف محمد عرفان صاحب اور دیگر فدائیان خلافت کی گرفتاری

بروز شنبہ ۲۸ اگست سنہ ۱۹۲۰ء کو گیارہ بجے فوجی مسلح گارد کے ذریعے حضرت مولانا محمد اسحٰق صاحب گرفتار کر کے فوجی موٹر اور فوجی گارڈ کے زیر حراست چھاؤنی ایبٹ آباد میں لائے گئے۔ تمام شہر مانسہرہ کے گرداگرد فوجی دستے لگائے گئے۔ مولانا کے مکان کے گرد مشین گنیں لگا دی گئی تھیں۔ عین اس وقت کہ مولانا صاحب ایک مہمان کے ہمراہ دستر خوان پر بیٹھے تھے اور ابھی ایک لقمہ بھی کھانا نصیب نہ ہوا تھا پولیس کپتان اور ایک فوجی کرنل و دیگر افسران پولیس و سول نے پہنچ کر اور سنگین چڑھا کر جناب مولانا محمد اسحٰق کو گرفتار کیا۔ کپتان پولیس نے جناب مولانا کے سینہ پر پستول لگایا۔ مولانا نہایت بشاشت اور امن وسکون کے ساتھ موٹر پر سوار ہو کر عامۃ المسلمین کو صبر و ضبط کی تعلیم دیتے ہوئے روانہ ہوئے اور ایبٹ آباد چھاؤنی کی فوجی عدالت میں لائے گئے مولانا محمد اسحٰق کے ہمراہ مولانا ابوالمعارف محمد عرفان صاحب سیکرٹری خلافت کمیٹی بھی گرفتار کر کے ایبٹ آباد لائے گئے۔ علاوہ ازیں میر جمعہ خان ساکن موضع شیخ البگڑھی اور مولانا محمد اسحٰق صاحب کے ایک ملازم اور ایک مہمان کو

بھی گرفتار کیا گیا خان صاحب ولی محمد خان جاگیردار اوگرہ کی بھی گرفتاری کی افواہ تھی۔ چنانچہ صاحب موصوف کو بذریعہ تار چیف کمشنر نے ایبٹ آباد بلایا۔ لیکن سردست ان کی گرفتاری عمل میں نہیں لائی گئی۔ مشہور تھا کہ معافی دی گئی۔ لیکن خان مذکور غالباً معافی لینے سے انکاری تھے۔ دیگر ارکین اور عہدیداران خلافت کمیٹی کی گرفتاری کا امکان تھا۔ مانسہرہ اور علاقہ مانسہرہ میں مارشل لا نافذ ہو گیا تھا۔

دوسرے روز اتوار ۲۹ ؍اگست کو تحصیل ایبٹ آباد، تحصیل ہری پور اور مانسہرہ کے دس بیس ہزار لوگوں کا مجمع عام تمام چھاؤنی کے گرداگرد جمع تھا اور مولینا صاحب کے لاکھوں مرید اور شیدائی سخت بیقراری میں انکی رہائی کا مطالبہ کر رہے تھے مسٹر بلش گرانٹ چیف کمشنر بذات خود مولینا محمد اسحٰق رح کی گرفتاری کی خاطر ایک ہفتہ سے ایبٹ آباد میں مقیم تھے مولینا کی گرفتاری بہت بڑی فوجی طاقت کی نمائش میں عمل میں لائی گئی۔ حالت نہایت تشویشناک تھی۔ اور پورے ضلع میں سخت پریشانی اور بے چینی تھی۔

مانسہرہ میں مارشل لاء

سرکاری حکم

مندرجہ ذیل سرکاری حکم شائع ہوا۔ یہ روزنامہ "زمیندار" لاہور مورخہ ۱۳ر اگست ۱۹۲۰ء سے نقل کیا گیا ہے۔

چونکہ تحصیل مانسہرہ میں بوجہ شورش برپا کردہ مولوی محمد اسحٰق سکنہ مانسہرہ نقصِ امن کا احتمال ہے۔ اس لئے مفصلہ ذیل احکام عام اطلاع کے واسطے جاری کئے جاتے ہیں:۔

(۱)۔ افواج شہر کی حفاظت کر رہی ہے۔ ہر ایک مرد، عورت، بچہ، جو کہ سرکاری ڈیوٹی پر نہ ہوں اپنے اپنے گھروں میں تاحکم ثانی آرام سے رہیں گے۔ اگر وہ کوچہ ہائے میں تماشہ دیکھنے کے واسطے یا کسی اور وجہ سے آویں گے تو خطرے کے ذمہ دار وہ خود ہوں گے۔

(۲)۔ شہر کو جو راستے جاتے ہیں۔ ان کی فوج حفاظت کر رہی ہے کسی آدمی کو بغیر اجازت ڈپٹی کمشنر بہادر یا ایسے حامیان کی جن کو صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر نے ایسے اجازت نامے عطا کرنے کیلئے مقرر فرمایا ہو، شہر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔

(۳) تمام بڑے جلسے تحصیل مانسہرہ میں فی الحال منع کئے جاتے ہیں۔ کسی جلسہ میں دس یا زیادہ آدمی شامل نہ ہوں۔ جو کہ برخلاف منعقد کیا جاوے۔ اس کو

فوجی حکام بشرط ضرورت تشدد سے منتشر کریں گے۔

(۴) تحصیل مانسہرہ میں سخت طور پر ممانعت کی جاتی ہے کہ کوئی شخص بندوق، تلوار کلہاڑی یا برچھی سے مسلح ہو کر نہ جاوے۔ اگر کوئی شخص اس طرح پر مسلح پایا گیا۔ تو فوراً گرفتار کیا جائیگا۔ اگر ضرورت ہوئی تو جبر و تشدد سے

(۵) ہر ایک مولوی، امام یا طالب کیلئے تحصیل مانسہرہ میں بغیر تحریری اجازت ڈپٹی کمشنر بہادر داخل ہونے یا باہر جانے کی سخت ممانعت ہے۔ جو شخص اس حکم کی خلاف ورزی کریگا۔ اس کو فوراً گرفتار کیا جاوے۔

(۶) صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر حسب معمول ہر وقت تحصیل مانسہرہ کے ملاقاتیاں کے دیکھنے کیلئے اور ان کی عرض سننے کیلئے تیار رہیں گے۔ لیکن دس آدمیوں سے زیادہ مجمع کو اکٹھا دیکھنے کی اجازت نہ ہو گی۔

(۷) اسی طرح آنریبل صاحب چیف کمشنر بہادر پانچ آدمیوں سے زیادہ کے ڈیپوٹیشن کو یکجا نہ دیکھیں گے بشرطیکہ صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کی اجازت پہلے حاصل کی جاوے

دستخط ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہزارہ

سرزمینِ بے آئین

پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بخونِ دل
سازِ چمن طرازیٔ داماں کئے ہوئے
کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

خداوند صوبہ سرحد سر ہملٹن گرانٹ چیف کمشنر اور ڈائر ہزارہ میجر جیمز کے جبر و استبداد نے مانسہرہ، ایبٹ آباد، ہری پور کے علاقہ کو حضرت مولانا محمد اسحٰق، جناب مولانا ابو المعارف محمد عرفان اور دیگر بے شمار خدام خلافت کے فیوض سے محروم رکھا اور علاوہ بریں خود اس علاقہ میں خلاف تعاون تشدد کا وہ طوفان برپا کیا کہ تحریکِ خلافت قطعاً مردہ کر دی گئی۔ صوبہ سرحد کے غیور و پُر جوش مسلمان دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے تھے اور اپنی ناگوار پابندیوں سے دبے جاتے تھے۔

ضلع ہزارہ میں تحریکِ خلافت کے رہنماؤں کو اسیر قید بلا کر کے اور جلسہ ہائے خلافت کا سدِ باب کرنے کیلئے سرحدی حکام اور علاقہ کے سرکاری خوشامدیوں اور کمینہ خصلت مخبروں نے جن عجیب و غریب مکائد و سازش سے کام لیا۔ وہ حکومت انگریزی کے دامن پر ہمیشہ نہایت سیاہ دھبوں کی صورت میں نمایاں رہیں گے۔ جب اس علاقے میں تحریکِ خلافت کا آغاز ہوا تو خلافت کمیٹی کے زیرِ اہتمام عظیم الشان جلسے منعقد ہونے لگے جن میں سرحد کے پُرجوش اور باحمیت مسلمان جوق در جوق حصہ لینے لگے چونکہ ضلع ہزارہ میں تحصیل مانسہرہ اور تحصیل ایبٹ آباد و ہری پور کے بعض دیہات قانون اسلحہ سے مستثنےٰ تھے اس لئے یہ عوام کی عادت میں داخل تھا کہ وہ جلسوں

اور میلوں بلکہ شادی بیاہ کی تقریبوں میں بھی مسلح ہو کر شریک ہوتے تھے۔ چنانچہ جلسہ ہائے خلافت میں بھی وہ اپنی عادت کے مطابق مسلح ہو کر شریک ہوئے تھے۔ ان کے مسلح ہونے سے یہ اندازہ کرنا غلطی تھا کہ ان کا ارادہ شور و فساد تھا۔

صادق اور مخلص مسلمانوں کے علاوہ کچھ خان بہادروں اور جاہ پسندوں نے بھی ایک جال بچھا رکھا تھا اور اپنے بہت سے پٹھوؤں کو خفیہ طور پر اس خدمت کیلئے مامور کر رکھا تھا کہ تم بھی خلافت کی تحریک میں شریک رہو اور حتی الوسع فساد کرانے کی کوشش کرو۔ چنانچہ وہ سب "خان بہادر نمک خوار" بندوقیں، تلواریں، پستول اور چھرے لئے ہوئے خلافت کے جلسوں میں شامل ہوئے۔ اور بہت زور و شور سے نعرہ تکبیر کیا کرتے۔ علاوہ بریں دیہات کے سادہ اور جاہل مسلمانوں کو بھی مسلح ہو کر آنے کی ترغیب دلاتے۔ چنانچہ مقام خاکی کے جلسۂ خلافت میں حالانکہ جلس خلافت نے اعلان عام کر دیا تھا کہ کوئی شخص مسلح شریک نہ ہو۔ اور اس اعلان کی تعمیل میں سرحدی آزاد قبائل کے لوگ غیر مسلح ہو کر جلسے میں آئے تھے۔ لیکن متذکرہ بالا جماعت صالحین کے مسلح آدمی اس جلسہ میں بھی ہتھیار باندھ کر آئے۔

حکام انتظامی اور پولیس کو ہمیشہ تحریک خلافت کی طرف سے خطرہ رہتا تھا پولیس تو مولینا محمد اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ صاحب سے خصوصی پرخاش رکھتی تھی۔ کیونکہ تحریک خلافت کے آغاز سے بیشتر چوری اور ڈکیتی کی مختلف وارداتیں پیش آئی تھیں۔ اور پولیس کی مٹھی گرم رہتی تھی۔ اس لئے پولیس نے خان بہادروں اور انتظامی افسران سے مل کر ایمان و صداقت کو بالائے طاق رکھا اور غلط ملط اطلاعات حکام تک پہنچانی شروع کر دیں۔ یہ کہا کہ تحریک خلافت کے علمبردار باغی ہیں۔ کبھی مولینا محمد اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کو واجب القتل بتایا گیا۔ کبھی فساد و خونریزی کا سخت خطرہ ظاہر کیا۔ غرض حتی الامکان ہر وقت حکام کے کان بھرنے شروع کئے۔

مسٹر فضل الرحمٰن ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس نے مقام بفہ میں ایک رضاکار خلافت کو سخت مارا۔ اس پر بہت جوش پھیلا۔ اور مجلس خلافت نے بذریعہ تار حکام سے مطالبہ کیا کہ فضل الرحمٰن کے اس فعل پر حسب ضابطہ کارروائی کی جائے۔ لیکن پر دیوان نندرام تحصیلدار نے اپنے ایک چپراسی کو اکسا کر حضرت مولینا محمد اسحاقؒ کو فحش گالیاں دلوائیں۔ مقصد یہ تھا کہ رضاکار کی زدوکوب پر تو لوگوں میں اشتعال پیدا ہو ہی چکا تھا۔ مولینا کے حق میں دشنام کا اثر اور بھی اشتعال انگیز ہوگا۔ اور جب فساد و خونریزی تک نوبت پہنچے گی تو حکام کو تحریک خلافت کے پامال کرنے کا بہت اچھا موقع ہاتھ آجائیگا۔ لیکن مولینا کے عقیدت مند اور ارادت کیش مسلمانوں نے نہایت صبر و سکون سے کام لیا اور معاملہ یہیں دبا دیا گیا۔

اسی دوران میجر جیمز ڈپٹی کمشنر نے بے بنیاد اطلاعات کی بنیاد پر تحصیل میں فوجی نقل و حرکت شروع کرا دی۔ اس حرکت کا مقصد بھی یہی تھا۔ کہ لوگوں میں جوش پیدا ہو۔ اور وہ اندھا دھند کوئی حرکت کر بیٹھیں۔ لیکن تحریک خلافت کے حامیوں کو فساد سے کیا واسطہ؟ اگر ان کے سر میں بغاوت کا سودا سمایا ہوتا۔ تو حدود تحصیل کے کنارے پر پہلے ہی دستہ فوج سے لپٹ پڑتے۔ اور خون کے دریا بہا دیتے۔

جب اس تدبیر میں بھی حکام کو ناکامی ہوئی۔ تو "خوانین سرکاری" اور افسران پولیس نے عجیب و غریب چال اختیار کی۔ اپنے مبلغین اور مفسدین کے ذریعے سے نواح تحصیل میں مشتہر کرا دیا۔ بلکہ بعض علاقوں میں حضرت مولینا کی طرف سے جعلی خطوط بھی بھجوا دیئے۔ کہ جمعہ کے دن عیدالاضحےٰ ہے اور جہاد کیلئے نہایت بابرکت و مناسب ہے۔ آپ سب لوگ مسلح ہو کر مانسہرہ آجائیں۔ تاکہ فوجی کیمپ پر دھاوا کیا جا سکے۔

مجلس خلافت کا ہر جمعہ کو ایک جلسہ منعقد ہوا کرتا تھا۔ لیکن اس جلسہ کے

متعلق ان غلط اطلاعات کی بناء پر بعض آدمی دیہات سے حضرت مولینا محمد اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور دریافت کیا کہ آیا آپ کا ارادہ فتوائے جہاد دینے کا ہے؟ کیا ہم مسلح ہو کر آئیں؟ مولینا نے ان کو مسلح آنے سے روکا مزید برآں رضاکاروں کو حکم دیا کہ اس وقت بازار میں جو دیہاتی آئے ہوئے ہیں ان سے صاف کہہ دو کہ اپنے اپنے گاؤں میں جاکر اعلان کردیں کہ کوئی شخص مسلح ہو کر نہ آئے۔ لیکن بے ایمان لوگ اپنا کام بڑے پیمانے پر کر چکے تھے۔ قریبی دیہات تک مولینا صاحب کا حکم پہنچ گیا لیکن دور کے لوگ اکثر بے خبر رہے۔

دوسرے دن ۱۷ اگست ۱۹۲۰ء کو بروز جمعہ حضرت مولینا مسجد میں نماز کیلئے تیاری کر رہے تھے کہ لوگوں کا ہجوم ہر طرف سے داخل ہونا شروع ہوا۔ اور ان میں علاقہ تناول تین حصوں میں منقسم تھا:

۱۔ ریاست امب، جو نواب صاحب کے زیر تسلط تھا۔

۲۔ ریاست پھلڑہ بھی خود مختار تھی۔ اور خانبہادر عطا محمد خان کے زیر تصرف تھی۔

۳۔ علاقہ تناول گڑھیاں، اس پر سرکار کا قبضہ تھا۔

ان مسلح لوگوں میں سے اکثر تناول گڑھیاں یعنی سرکاری علاقے کے تھے اور کچھ ریاست سے بھی آئے۔ لیکن مانسہرہ کے خوانین کو چونکہ نواب صاحب سے صدسالہ خاندانی پرخاش تھی۔ وہ تمام الزامات کو نواب صاحب کی طرف منسوب کرتے تھے۔ اور حکومت برطانیہ اور نواب صاحب کے تعلقات کو متزلزل کرنے سے ان کے ذاتی اغراض پورے ہو سکتے تھے۔

جب مولینا محمد اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ کو اطلاع پہنچی کہ لوگ کثیر تعداد میں آرہے ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہوا۔ کہ مخالفین نے اپنی بدباطنی سے لوگوں میں یہ مشہور کر رکھا ہے۔ کہ آج کیمپ پر جہاد کیا جائیگا۔ تو وہ بہت متعجب ہوئے۔ اتنے میں حاجی مقرب خان

خانخیل، رنگ زرد با چشم تر پاجامے کے پائنچے اٹھائے دوڑتا ہوا مسجد میں آیا، اور کہنے لگا کہ مولینا! خدا کیلئے کوئی بندوبست کیجئے ورنہ میرا اور اللہ داد خان کا خاندان تباہ ہوجائے گا۔

مولینا ممدوح نے نہایت خندہ پیشانی سے کہا کہ آپ بالکل نہ گھبرائیں بفضلہ تعالیٰ ہرگز فساد نہ ہونے پائیگا۔ اس کے بعد آپ نے نعرۂ تکبیر لگایا اور وہاں سے نکل کر شہر سے باہر نصف میل پر جا پہنچے۔ تمام لوگ بھی مولینا کے پیچھے پیچھے چلے گئے اور میدان میں جمع ہوگئے۔ یہ مجمع پچاس ہزار سے کسی طرح کم نہ تھا۔ مولینا نے نماز جمعہ میدان میں فرش خاک پر ادا کی۔ اور اس سے فارغ ہوکر ایک مؤثر تقریر میں لوگوں کے جوش کو فرو کیا۔

اس مقام پر لوگوں نے مولینا سے عرض کیا کہ ہمیں اطلاعات موصول ہوئی ہیں کہ آپ آج ہمیں فتوائے جہاد دیں گے؟ مولینا نے فرمایا۔

"میرے بھائیو! ابھی تمہارے لئے جہاد بالسیف کا وقت نہیں ہوا۔ یہ سب افواہیں بے ایمانوں کی پھیلائی ہوئی ہیں۔ میری جانب سے تمہیں ہرگز فساد کی اجازت نہیں، اگر تم مجھے عزیز سمجھتے ہو۔ اور خلافتِ مقدسہ کے ساتھ خلوص دل سے محبت رکھتے ہو تو بلا شور و فساد واپس چلے جاؤ ــــــ"

اس کے بعد مولینا نے پوچھا

"کیا تم میرا حکم ماننے کیلئے تیار ہو؟"

آوازیں آئیں کہ بالکل تیار ہیں۔ مولینا موصوف نے فرمایا۔

"میں تم کو حکم دیتا ہوں کہ تم بغیر کسی شور وغل یا فساد و بدنظمی کے اپنے اپنے گھروں کو چلے جاؤ۔"

اس کے بعد مولانا نے اس ہجوم کے سرکردہ افراد سے حلف لیا اور رضاکاروں کے ذریعے سے اس عظیم اجتماع کے تین حصے کر کے انہیں دور دور لے جا کر منتشر کر دیا

اسی روز چیف کمشنر کی آمد آمد تھی۔ چنانچہ مولانا ابوالمعارف محمد عرفان اور مولوی غلام ربانی کی زیر نگرانی چند دستے متعین کر دیئے۔ کہ رضاکاروں کی وساطت سے بازار خالی کرا دیں۔ چنانچہ نہایت عمدگی اور خوش اسلوبی سے بازار خالی کر دیا گیا۔ سڑک پر جا بجا رضاکار مقرر کر دیئے گئے۔ چیف کمشنر امن و امان سے مانسہرہ کے ڈاک بنگلے میں پہنچے۔ اور تقریباً آدھ گھنٹہ ٹھہر کر بخیریت واپس چلے گئے۔

اگر چیف کمشنر اپنے لاڈلے خان بہادر حسین خان جاگیردار مانسہرہ کو یہ بتلا دیتے کہ میں مولانا کی گرفتاری کا حکم دیئے جاتا ہوں۔ تو شاید وہ مطمئن ہو جاتا۔ لیکن اس قسم کی تسلی نہ پا کر اس نے ایک اور عیاری اختیار کی۔ چند آدمیوں کو یہ پٹی پڑھائی۔ کہ تم لوگ شہر میں یہ افواہ مشہور کر دو کہ تنولی لوگ رات کو شہر پر ڈاکہ ڈالنے والے ہیں اور فلاں پہاڑی میں گھات لگائے بیٹھے ہیں۔ یہ افواہ خان بہادر نے اپنے بھائی مقرب خان تک بھی پہنچا دی۔ بس پھر کیا تھا۔ وہ حواس باختہ ہو گیا۔ اور عصا ہاتھ میں لے کر در بدر مارا مارا پھرنے لگا کبھی مولانا کے دولت خانے پر آتا۔ کبھی جمعہ خان کی ڈیوڑھی پر پہنچتا۔ کبھی مولانا ابوالمعارف محمد عرفان مولوی غلام ربانی اور محمد ایوب خان سے کہتا پھرتا۔ کہ خدا کیلئے کوئی انتظام کرو۔ مولانا ابوالمعارف محمد عرفان تو شام کو اپنے گاؤں پکھوال چلے گئے۔ محمد ایوب خان نے اس کے کہنے سننے کی چنداں پروا نہ کی۔ لیکن مولوی غلام ربانی صاحب رات کو دو دفعہ ان پہاڑیوں میں گشت لگا آئے۔ کہیں تنولیوں کا نام و نشان بھی نہ تھا۔

ادھر خان بہادر اور لالہ جے رام نے حکام تک اس ڈاکے کی افواہ پہنچا دی۔

اور بازار کے ہندو دکان داروں کو فریادی بنا کرے گئے۔ حکام نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ بلا تحقیق راستوں پر فوج کے سپاہی متعین کر دیئے۔ اور پولیس کو بھی مسلح کر کے پہرے پر مامور کر دیا۔

اس کے بعد خان بہادر نے ایک عیارانہ چال کھیلی۔ اپنے چھ ملازموں میں سے تین کو تو اپنے داماد کا باڈی گارڈ مقرر کر کے تنولیوں کی تلاش پر مامور کر دیا۔ اور تین ملازم تنولی بن کر سامنے ایک محفوظ مکان میں پوشیدہ ہو گئے۔

جب رات کو فوجی سپاہیوں نے تمام مشتبہ پہاڑیوں پر قبضہ کر لیا۔ اور پولیس پہاڑی کے دامن میں پہنچی۔ تو ان بناوٹی تنولیوں نے بندوق کے فائر کرنے شروع کر دیئے۔ اور پھر ایک باغبان کی کوٹھڑی میں گھس گئے۔ ادھر ہمایوں خان کی ماتحت گارد نے فائر کیا۔ جس سے مقرب خان کا قتل مقصود تھا۔ لیکن وہ خوش قسمتی سے بچ گیا۔ فوجی دستے نے بندوق کے فائر سن کر جھٹ اسی رخ پر باڑ چلا دی۔ بناوٹی تنولی تو کوٹھڑی کے اندر تھے۔ صرف پولیس سامنے تھی۔ پولیس نے بھی جواب میں فائر شروع کر دیئے۔ روایت ہے کہ دو گورکھے زخمی بھی ہوئے۔ اس پر جھٹ افسروں نے سپاہیوں کو خبردار کر دیا۔ ورنہ پولیس اور فوج میں مزے کی مڈبھیڑ ہو جاتی۔ ہر چند تنولی ہر طرف تلاش کیے گئے۔ لیکن کہیں ہوتے تو ملتے۔ بہرحال باشندگان نے اس مصنوعی جنگ کا تماشا دیکھ لیا۔

جب صبح ہوئی تو عجیب نظارہ تھا۔ شہر کے تمام گلی کوچے فوجی سپاہیوں سے پٹے پڑے تھے۔ بازار میں رسالہ دوڑ دھوپ کر رہا تھا۔ مکان کی چھتوں پر کلدار توپیں نصب تھیں۔ آخر گیارہ بجے مولانا محمد اسحٰقؒ کھانا کھا رہے تھے۔ پولیس نے آ کر ان کو گرفتار کر لیا۔ اور ننگے پا برہنہ گھسیٹ کر موٹر لاری تک پہنچایا۔ لاری کے پاس پہنچنے پر ایک خادم نے جوتا لا کر مولانا کو پہنا دیا۔ مولانا لاری میں

سوار کئے گئے۔ اور ایبٹ آباد پہنچا دیئے گئے۔

شہر کے چند آدمیوں سے سنا گیا۔ کہ جب حاجی مقرب خان کو مولینا کی گرفتاری کی خبر پہنچی تو اس نے کہا۔ خدا کا شکر ہے کہ اب امن و امان ہوگیا فی الحقیقت یہ خیال صحیح ہے کہ حاجی مقرب خان اور اللہ داد خان برادر جمعہ خان اور محمد ایوب خان تینوں نے صرف حکام سے اپنی جان بچانے کی خاطر مولینا کی گرفتاری میں حصہ لیا۔ (روزنامہ" زمیندار" لاہور۔ ۱۲ اپریل ۱۹۲۱ء)۔ خان بہادر حسین خان نے علاقہ تناول میں جو غلط افواہیں پھیلائیں اور پھر ٹولیوں کے ڈاکہ ڈالنے کی خبر مشہور کی۔ اس میں اس کے دو مقصد تھے۔ ایک تو اسے مولینا ممدوح اور دیگر خدام خلافت کی بربادی منظور تھی۔ اور دوسرا مطلب یہ تھا کہ نواب صاحب والئ امب اور قوم تنولی کو جن سے اسے آبا و عناد اور صد سالہ خصومت تھی بدنام کرے۔

حضرت مولینا محمد اسحاق صاحب کی گرفتاری کے بعد مولینا ابوالعارف محمد عرفان اور پھر یکے بعد دیگرے تمام خدام خلافت گرفتار کر لئے۔ طریق گرفتاری بھی عجیب و غریب تھا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ایک سو سادہ فارم وارنٹ گرفتاری کے لے کر اپنے دستخط و مہر ثبت کر کے پولیس کو دے دیئے بس مسٹر فضل الرحمٰن کی حکومت ہوگئی جسے چاہا دبا یا مطلب نکالا چھوڑ دیا۔ جس سے مقصد پورا نہ ہوا۔ اس کے نام وارنٹ جاری کر کے حوالات میں پھینک دیا۔" اندھیر نگری چوپٹ راجہ" فضل الرحمٰن کا غضب انتہائے کمال پر تھا۔ پولیس کی پانچوں انگلیاں گھی میں تھیں مارشل لا سے بھی زیادہ مصیبت ناک حالت ہو رہی تھی۔ کس کی طاقت تھی۔ کہ پولیس کی خدائی کے سامنے دم مارے۔ یا لب ہلا سکے۔ اس دورِ مظلمہ میں پولیس نے جس قدر جبر و استبداد سے کام لیا۔ اور جتنے دلدوز واقعات پیش آئے

ان کی تفصیل اگر لکھی جائے۔ تو پوری کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

درحقیقت انگریزوں نے اس موقع پر تدبر اور دانشمندی کا دامن بالکل چھوڑ دیا تھا۔ اور جیمز ڈپٹی کمشنر نے عقل سے بیگانگی اختیار کر کے رعایا کو حکومت سے بدگمان کرنے میں اپنے لئے مشکلات کا دروازہ کھول دیا۔

مولینا محمد اسحاقؒ جیسے قائد عزیز و محبوب کی گرفتاری پر کوئی بدنظمی و خونریزی کیوں ظہور میں نہ آئی۔ اگر خطرات فی الحقیقت ویسے ہی ہوتے جیسے ارباب حکومت نے ظاہر کئے تھے تو چاہئے تھا کہ اس دن مانسہرہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جاتی۔ خدام خلافت حیران و پریشان تھے کہ ہم نے قیام امن کے لئے کتنی جانفشانی سے کوشش کی۔ اور پچاس ہزار کا جوش میں بھرا ہوا مجمع نہایت سکون کے ساتھ منتشر کر دیا۔ لیکن اس کے باوجود حکومت کی طرف سے آج یہ فتنہ برپا ہو رہا ہے۔

میجر جیمز نے بہت سی سیاسی خدمات بھی انجام دی تھیں۔ اور چیف کمشنر کی زبان میجر جیمز کی تعریف و توصیف میں خشک ہوئی جاتی تھی۔ اور تدبّر و دانش کے اس دیوتا نے یہ نہ سوچا کہ وہ ڈاکہ ڈالنے والے ٹولی کدھر گئے؟

خدام خلافت نے جو بغاوت اور سرکشی کی سفروضہ سازش کر رکھی تھی۔ اس کا سراغ کس حد تک نکلا؟ خان بہادر نے جو بے سروپا اطلاعات حکام تک پہنچائی تھیں۔ ان کی صحت یا عدم صحت پر بھی میجر جیمز نے کبھی غور کیا؟ مولینا محمد اسحاقؒ جیسے حقیقت پسند کو گرفتار کرنے کے لئے اس قدر طاقت کی نمائش اور فوج کی نقل و حرکت کی کیا ضرورت تھی؟ مولینا صاحب بارہا ڈکسرا اسسٹنٹ کمشنر مانسہرہ کے پاس اسی طرح تشریف لے گئے۔ کیا ایک فرد واحد کی گرفتاری کے لئے جو کوئی طاقت نہیں رکھتا، کوئی مسلح افواج

نہیں رکھتا۔ کلدار توپیں اور ہوائی جہاز نہیں رکھتا۔ اس قدر ساز و سامان مہیا کرنا حکومت کی کمزوری کا ثبوت نہیں تھا۔ بلکہ یہ سیاسی حکمت عملی محض تحریک خلافت کو کچلنے کیلئے بروئے کار لائی گئی

ایک اور عجیب واقعہ قابل ذکر ہے۔ کہ حضرت مولینا کی گرفتاری کے بعد ایک فوجی دستہ اوگی جانے لگا تو خان بہادر کی مفسدہ پرداز جماعت نے حکام سے یہ کہا۔ کہ وہ تمام علاقہ باغی ہو چکا ہے۔ لہذا فوج امن و امان سے نہ گزر سکے گی۔ یہاں تو خان بہادر کی بات آیت حدیث تھی۔ فوراً بلا تحقیق و تفتیش دیہات کے خوانین اور نمبرداروں کے نام احکام جاری کر دیئے گئے۔ کہ وہ راستہ کا انتظام کریں۔ رات کو فوجی دستہ نے کوچ کیا تو جس جس دیہات کی حدود میں فوج پہنچی وہاں کے لوگ ہاتھوں میں لالٹینیں لئے ہوئے ساتھ ہو جاتے۔ اور دوسرے گاؤں کی حدود تک پہنچا آتے۔ اسی طرح سلسلہ بہ سلسلہ راتوں رات یہ فوج اوگی پہنچی۔ کچھ فوج پہلے ہی سے اوگی میں موجود تھی۔ جب دونوں فوجوں کا ملاپ ہوا۔ تب جا کر کہیں خوانین اور نمبرداروں کی خلاصی ہوئی۔

"پرجا رن راجا بانسی" کبھی ایک گاؤں پر بم اندازی کی گئی کبھی دوسرے پر توپ کے گولے برسائے گئے۔ کبھی کبھی ریاست پر ایک دو بم پھینک کر رعب حکومت دکھایا۔ کبھی ہوائی جہازوں سے سرحدی قبائل کو ڈرایا دھمکایا۔ غرض ایک تحریک خلافت کی سرکوبی کے بہانے سے تمام علاقہ سرکاری و غیر سرکاری پر دہشت گردی کی حکمت عملی جاری و ساری کر دی گئی۔

ان واقعات روح فرسا کے بعد جتنے خدام خلافت زیر حراست تھے ان کو وقتاً فوقتاً میجر جیمز بلاتے اور زیر دفعہ ۴۰ قانون جرائم سرحدی ضمانت طلب کرتے۔ جو شخص ضمانت دینے پر آمادگی ظاہر کرتا وہ چھوڑ دیا جاتا۔ آخر ۲۱ر اکتوبر کو مولوی غلام ربانی صاحب چھوڑے گئے۔ جن کو غالباً ۱۰ر نومبر یا اس سے پہلے ضمانت

زیر دفعہ ۴۰ سرحدی لے کر رہا کر دیا گیا۔ لیکن یہ ضمانت وغیرہ کی کارروائی بھی بالکل خلاف قاعدہ اور بے ضابطہ ہوئی۔ کیونکہ دفعہ ۴۰ کے ضمن ۲ کی رو سے ڈپٹی کمشنر پر لازم تھا کہ وہ حسب ضابطہ دفعہ ۴۲ قانون مذکورہ باضابطہ تحقیقات کرتے۔ نہ شرارن کونسل سے رائے لی گئی نہ اسیران بلا کے خلاف کوئی شہادت قلمبند کی گئی۔ بس ہر ایک کی بابت یہ لکھ دیا کہ تین سال کیلئے ضمانت داخل کرے۔ ورنہ تین سال قید بامشقت بھگتے۔ لیکن ان میں سے کسی کی نیت بغاوت یا شورش انگیزی کی نہ تھی۔ اس لئے کسی نے تین سال قید منظور نہ کی اور سب رہا ہو گئے۔

لیکن باوجود اس امر کے کئی مہینے گذر گئے فساد و شورش کا کوئی سراغ تک نہ نکلا۔ حضرت مولانا محمد اسحٰق اور مولانا ابو المعارف کے خلاف کوئی جرم ثابت نہ تھا میجر جیمز کی حرکتیں بدستور رہیں۔ ضلع ہزارہ میں مسلمانوں کی مذہبی آزادی بالکل سلب ہو چکی تھی۔ اور اندر ہی اندر جذبات مشتعل ہو رہے تھے۔ بالآخر یہ کوہ آتش فشاں اپنے مخصوص انداز میں پھوٹ پڑا۔ اس کے نتائج کا ذمہ دار کون تھا؟

ان تمام واقعات کو مولانا ظفر علی خان مدیر و مالک "زمیندار" اخبار نے رقم کیا اور ان کا دعویٰ تھا کہ جتنے واقعات باخبر مقالہ نگاروں نے "زمیندار" کو بہم پہنچائے ہیں وہ سب درست ہیں اور اگر حکام کو ان کی درستی میں شبہ ہو تو ایک مجلس تحقیقات مقرر کر کے تصدیق کرے۔ اس سلسلۂ مضامین سے قارئین کرام اور حکومت ہند پر یہ منکشف کرنا مقصود ہے کہ صوبہ سرحد میں حکام انگریزی کا نظام حکومت محض جھوٹے اور مفسدہ پرداز خوانین اور مخبروں کی غلط اطلاعات پر مبنی ہے اور میجر جیمز کی تدبیر و دانشمندی سر ہملٹن گرانٹ سے خراج تحسین وصول کر چکی ہے۔ حقیقی واقعات و حالات سے اس قدر بے خبر واقع ہوئے کہ صورت حالات کا صحیح اندازہ کرنے کیلئے تحقیقات و تفتیش کی زحمت بھی نہیں اٹھاتے۔ اور اندھا دھند

فوجی کارروائی پر اتر آئے ہیں۔

جب تک حکومت صوبہ سرحد اپنی حکمت عملی میں کافی ترمیم و اصلاح نہ کریگی جب تک میجر جیمز کو ہزارہ کی حکومت سے سبکدوش نہ کیا جائیگا۔ جب تک اس علاقہ سے زائد فوج نہ ہٹا لی جائیگی۔ جبتک تحریک خلافت کے کارپردازوں کو مذہبی آزادی نہ دی جائیگی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ علاقہ ہزارہ کے مسلمہ مذہبی مقتدر اور رہنما حضرت مولانا محمد اسحٰقؒ اور ان کے مددگار مولانا ابو المعارف محمد عمر خان رہا نہ کر دیئے جائیں حقیقی امن و امان بحال نہیں ہو سکتا۔ اور عوام کے جذبات فرو نہیں ہو سکتے۔

برطانوی سیاست کے عالمی اثرات

تحریک خلافت کے ایام میں برطانوی سیاست کے اثرات برصغیر ہند و پاک اور ممالک اسلامیہ پر مرتب ہوئے۔ دہشت انگیزی اور بیجا تشدد (بقول انگریزوں کے) بولشویکوں کا شیوہ تھا۔ جب حکومت انگریزی کے ارباب تبلیغ و اشاعت ہمیں جرمنی کے مظالم، بلجیئم اور بولشویکوں کی خونخواری کی داستانیں سنا سنا کر ان دونوں قوموں سے متنفر کرنا چاہتے تھے تو انہیں چاہیئے تھا کہ اپنے آپ کو ان سے مختلف ثابت کرتے اور ہمیں اس امر کے ثبوت بہم پہنچاتے کہ وہ ان دونوں قوموں کے خلاف نہایت انصاف اور رواداری پر حامل ہیں۔ لیکن اگر یہی خونخواری، یہی ظلم و جبر، یہی دہشت انگیزی حکومت انگریزی کے ماتحت بھی تھی تو بولشویکوں کو ان کے جبر و تشدد کی وجہ سے مطعون کرنا بالکل نامناسب تھا۔

بولشویکوں کی اولوالعزمی سے کون انکار کر سکتا تھا۔ بولشویکوں نے ایرانیوں اور

افغانوں کے ساتھ جو معاہدے کئے تھے۔ اور ان کو جو مراعات حاصل تھیں ان کا خلاصہ ارباب بصیرت سے پوشیدہ نہیں۔ اگر حکومتِ برطانیہ کو ایران اور افغانستان سے یہ شکایت تھی کہ یہ دونوں ممالک بطیب خاطر انگریزوں کی دوستی اختیار نہیں کرتے تو اس کی وجوہ نہایت واضح اور روشن تھیں۔ بولشویکوں کا مقصد سرمایہ دارانہ حرص و ہوا نہیں تھا۔ وہ ملک گیری اور توسیع سلطنت نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایران کو وہ جزائر اور وہ خطے نہایت فیاضی سے واپس دے دیئے۔ جو ۱۸۹۲ء میں زار کی حکومت نے ایرانیوں سے چھین لئے تھے۔ اس کے علاوہ گذشتہ تمام قرضے معاف کر دیئے۔ ریلوں، سڑکوں، تار اور ٹیلیفون پر سے اقتدار اٹھا لیا۔ اردسیہ اور انزلی کی بندرگاہوں پر ایرانیوں کو پورے حقوق دیئے اور ایران میں روسیوں کی مذہبی تبلیغ و اشاعت کا بھی سدباب کر دیا۔

اس کے علاوہ افغانستان کو وہ تمام سرحدی علاقہ جو گذشتہ صدی میں روس نے لیا تھا واپس دے دیا گیا۔ اور ایک لاکھ روبل سالانہ بطور امداد دینے کا وعدہ کیا گیا۔ حکومت برطانیہ خود ہی انصاف سے کہہ دیتی کہ اگر ایرانیوں اور افغانوں نے انگریزوں کی دوستی ترک کرکے بولشویکوں کے ساتھ یارانہ گانٹھ لیا تو اس میں ان کا کیا قصور تھا؟ اگر انگریز بھی اسی فراخ دلی سے کام لیتے تو بولشویکوں کو یہ موقع ہی کیوں ملتا کہ وہ ان ممالک کو اپنے جال میں پھنساتے۔ مقام افسوس تھا کہ لارڈ کرزن کے معاہدہ ایران و انگلستان میں کسی فیاضی یا رواداری کا نام و نشان نہ تھا۔ چنانچہ اس معاہدہ کا وہی حشر ہوا جو اس قسم کی مستبدانہ دستاویزات کا ہوا کرتا ہے۔

اگر انگریز بھی بولشویکوں کی طرح ایران و افغانستان کو آزاد و خود مختار رہنے دیتے۔ ان دونوں ممالک کے مطلوبہ علاقے ان کے حوالے کرتے اور نیک نیتی کے

ساتھ معاہدہ کرتے تو کیا ایرانیوں اور افغانوں کا سر پھرا تھا کہ وہ خواہ مخواہ انگریزوں سے عدم تعاون کر کے روسیوں کے ساتھ جا ملتے؟ لارڈ کرزن اور ان محبان "بادہ پیما" "خونخوار" روسیوں کی مہذبانہ اور شریفانہ اولوالعزمی دیکھ کر شرمانا چاہیئے تھا۔

انہی دنوں گاندھی جی نے اپنے اخبار "ینگ انڈیا" کی تازہ اشاعت میں ایک مقالہ "کانگرس کے آئین ترکیبی" کے عنوان سے سپرد قلم فرمایا۔ اس مضمون کا تمام و کمال ترجمہ ملک کے اکثر و بیشتر اخبارات میں شائع ہوا۔ لیکن اس کے مطالب کا مختصر خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

گاندھی جی نے تجویز پیش کی تھی کہ ۳۰ جون ۱۹۲۱ء سے پہلے تین کام تو قطعاً مکمل ہو جانے چاہئیں۔ اول یہ تلک سوراج فنڈ میں ایک کروڑ روپے کی رقم جمع ہو جائے دوم کانگرس رجسٹر پر ایک کروڑ ممبروں کے نام درج ہو جائیں۔ سوم کم از کم بیس لاکھ خاندانوں میں چرخے کا رواج ہو جائے۔

تمام ہندوستان کے شہروں، قصبوں اور دیہات کی کانگرس کمیٹیوں کو چاہیئے کہ ان تینوں امور پر سب سے زیادہ توجہ منعطف کریں۔ تیس کروڑ باشندوں کے بر اعظم سے ایک کروڑ روپیہ جمع کر لینا کوئی بڑی بات نہیں۔ اگر فراہمی چندہ کے کام میں تنظیم و ترتیب ہو تو نہایت آسانی سے سارا کام انجام پا سکتا ہے۔ اور ایک ہفتہ کے اندر اندر کروڑ سے بھی زیادہ روپیہ جمع کیا جا سکتا ہے۔ کانگرس والوں کو اس میں سخت کوشش، محنت اور جانفشانی سے کام لینا چاہیئے۔ اور عوام پر لازم ہے۔ کہ وہ خود روپیہ دیں، دوسروں سے جمع کریں اور کانگرس کا خزانہ بھر دیں۔

کانگرس کے رجسٹر پر ایک کروڑ ممبروں کے نام درج کرنا کچھ مشکل نہیں۔ چار آنہ سالانہ ہر شخص دے سکتا ہے۔ اس لئے غریب سے امیر تک چپڑاسی سے کروڑ پتی تک

تمام بالغ مرد و زن کم از کم چار آنہ سالانہ دے کر کانگرس کے ممبر ہو جائیں۔ آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ ہندوستان کیلئے جد و جہد آسان ہے۔

انہی ایام میں افغانستان میں عدم تعاون ہوا اور غیروں کے سامنے بھرم کھل گیا کہ سر ہنری ڈابس وزیر خارجہ ہندوستان کی سرکردگی میں جو وفد کابل آیا ہوا تھا۔ اس کے ملازموں میں تین معزز ہندوستانی مسلمان فرید احمد، شہزادہ خان اور نور محمد ساکنان ضلع ہزارہ جو انگریزی وفد کے موٹربان تھے اور ایک اور شخص مسمی خواص خان ساکن ضلع پشاور جو گاڑی بان تھا ان چاروں اصحاب نے اپنے آقاؤں سے عدم تعاون کر دیا اور نظام جلیلہ عدلیہ افغانستان میں حاضر ہو کر اس مضمون کی ایک عرضی پیش کی کہ

"ہم چاروں ملت محمدیہ کے خادم دولت برطانیہ کے فرمانبردار اور خلافت مقدس اسلامیہ کے خیر خواہ ہیں۔ دولت برطانیہ کے وفد کے ہمراہ آنے کا مقصد صرف ملازمت ہی نہ تھا بلکہ ہم نے روانگی سے قبل یہ مصمم ارادہ کر رکھا تھا کہ دولت برطانیہ معاہدہ ترکی میں ترمیم نہیں کرتی اور عالم اسلامی کے جذبات کا احترام کر کے اماکن مقدم و آثار متبرکہ اسلام کو آزادی نہیں دیتی۔ لہذا ہم اس حکومت کی ماتحتی سے ہجرت کر کے دولت خداداد افغانستان کی آزاد رعایا بن جائینگے۔

چنانچہ آج ہم نے انگریزوں کی ملازمت چھوڑ دی ہے اور ہم حکومت عدلیہ افغانیہ سے استدعا کرتے ہیں کہ ہمیں بھی دیگر مہاجرین ہند مقیم افغانستان کی طرح اپنے ماتحت شرف امامت عطا فرمائے۔"

ان حضرات کی یہ درخواست احکام مذہب اسلام کے ماتحت فوراً منظور کر لی گئی۔ چنانچہ آئندہ یہ اصحاب افغانستان کی رعایا میں شمار کئے جائینگے۔

مسٹر ڈابس اور ان کے رفقاء کو اس موقع پر بہت رنج و افسوس ہوا ہوگا لیکن

"اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست"

شہنشاہیت پسندی کی حکمت عملی کا نتیجہ یہی ہوا کرتا ہے۔ ان ایام میں بھی افغانستان میں تمام دور و نزدیک حکومتوں کے نمائندے موجود تھے۔ جب یہ خبر کابل میں پھیلی تو دوسرے ممالک کے سفارت خانوں میں اس کا چرچا ہونا لازمی تھا۔ وہ سب لوگ یہی کہتے تھے کہ اللہ اللہ! اب حکومتِ برطانیہ ہندوستان میں اس قدر بے دست و پا ہو گئی کہ انگریزوں کو صرف چار ہندوستانی بھی ایسے نہیں مل سکتے جو خوشی سے اجرت اور معاوضہ پر بھی حکومت کی خدمت بجالانے کو تیار ہوں۔

ان دنوں مغربی حکومتوں کے ارباب حل و عقد صرف "اعتماد" کے قیام پر اپنا سب کچھ دینے کیلئے تیار تھے۔ مثلاً برطانیہ کی حکومت آئرلینڈ، مصر اور ہندوستان کی تحریکات آزادی سے سخت تنگ آ چکی تھی۔ لیکن محض ان ممالک کو آزادی نہیں دیتی تھی کہ حکومتِ برطانیہ کا "اعتماد" کھو جائیگا اور دنیا کی سلطنتوں پر بھرم کھل جائیگا۔ لوگ یہ کہیں گے بہت کمزور سلطنت ہے کہ ذرا سی شورش کی سرکوبی بھی نہیں کر سکی۔ بس یہ "اعتماد" کا خیال حکومت کے کروڑوں پونڈ اور ہزاروں جانیں ضائع کرا رہا تھا۔ لیکن یہ سوچنے کا مقام تھا کہ وفد برطانیہ کے موٹر بانوں اور گاڑی بانوں کے عدم تعاون سے ان حکومتوں کے نزدیک جن کے نمائندے اس وقت کابل میں موجود تھے۔ برطانیہ والوں کی کیا عزت رہ گئی تھی۔؟ کاش! اس قسم کے چھوٹے چھوٹے واقعات نے برطانیہ کے باریک بینوں کی آنکھیں کھول دی ہوتیں اور وہ صحیح صورتِ معاملات کو سمجھ سکتے۔

جس روز مولانا محمد اسحٰقؒ اور مولانا ابو المعارف محمد عرفان گرفتار کئے گئے۔ اس کے دوسرے روز یعنی بروز یک شنبہ ۱۹ اگست ۱۹۲۰ء بوقت ۸ بجے صبح محمڈن ہال واقع بیرون موچی دروازہ لاہور میں پنجاب خلافت کمیٹی

کے دستور اساسی پر غور و بحث کرنے اور مستقل عہدیداروں کے انتخاب کیلئے تمام صوبہ کی خلافت کمیٹیوں کے نمائندوں کا ایک اجلاس بصدارت مولوی عبدالحق صاحب عارضی صدر خلافت کمیٹی منعقد ہوا۔ مولینا ابوالکلام آزاد کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔

تلاوت قرآن مجید کے بعد مولینا ظفر علی خان صاحب نے پیرزادہ غلام دستگیر صاحب مرحوم و مغفور کی مساعی جمیلہ و خدمات حسنہ کا ذکر فرما کر آپ کی وفات حسرت آیات پر پنجاب خلافت کمیٹی کی طرف سے اظہار رنج کیا۔ چنانچہ فاتحہ خوانی کے بعد اظہار ہمدردی کی قرارداد منظور کی گئی۔

اس کے بعد مولینا ظفر علی خان نے رپورٹ سنائی اور دستور اساسی کو پیش کیا۔ جو بعد از بحث و مباحثہ و کافی غور و خوض منظور ہوا۔

دستور اساسی کی منظوری کے بعد حسب ذیل عہدیداران کا انتخاب عمل میں لایا گیا۔

صدر پنجاب خلافت کمیٹی:۔ جناب عبدالقادر صاحب سابق وکیل قصور

نائب صدر:۔ پندرہ اصحاب

سیکرٹری:۔ جناب آغا محمد صفدر صاحب بی۔ اے وکیل سیالکوٹ

خازن:۔ شیخ سراج دین صاحب پراچہ تاجر چرم لاہور

محاسب اعلیٰ:۔ ملک لال خان صاحب گوجرانوالہ

قرار پایا کہ ہر ضلع کی خلافت کے صدر و معتمدین بحیثیت عہدہ پنجاب خلافت کمیٹی کے ارکان ہونگے لاہور سے پندرہ ارکان منتخب کئے گئے۔ اور امرتسر سے سات چنے گئے۔

شام کے اجلاس میں کلکتہ خلافت کانفرنس اور اجلاس کانگرس کی شرکت کیلئے پنجاب خلافت کمیٹی کے نمائندوں کے انتخاب کا مسئلہ پیش کیا گیا۔

قرار پایا کہ بیس نمائندے پنجاب خلافت کمیٹی کی طرف سے بھیجے جائیں۔ ان کے خرچ کیلئے دو ہزار روپیہ منظور کر لیا گیا۔ قرار پایا کہ ہر ضلع کی خلافت کمیٹی اپنے خرچ پر دو نمائندے بھیجے۔ اور حضرات کو بھی شرکت کانفرنس کیلئے آمادہ کیا جائے۔ انتخاب نمائندگان کے بعد جلسہ برخاست کیا گیا۔ اسی طرح دیگر صوبوں کی کمیٹیوں کے زیر اہتمام خلافت کمیٹیوں کے اجلاس ہوئے۔ اور کلکتہ کانفرنس میں شرکت کے لئے نمائندگان کا چناؤ کیا گیا۔

اعلان کے مطابق آل انڈیا خلافت کانفرنس کا اجلاس شیخ الہند حضرت مولینا محمود الحسنؒ قبلہ کی زیر صدارت کلکتہ میں کانگرس کے پنڈال میں منعقد ہوا۔ جلسہ کی کارروائی ۵ ستمبر کو صبح ۹ بجے سے شروع ہو کر گیارہ بجے ختم ہوئی۔ دوسرا اجلاس اسی دن شب کے آٹھ بجے شروع ہو کر گیارہ بجے ختم ہوا۔ ۶ ستمبر کو کوئی اجلاس نہ ہوا۔ البتہ ۷ ستمبر کو شب کے آٹھ بجے تیسرا اجلاس ہوا۔ جو رات کے گیارہ بجے ختم ہوا۔ تماشائیوں اور نمائندوں کو ٹکٹ مہیا کرنے کے انتظامات کئے گئے اور خلافت کانفرنس کے جلسہ میں باہر سے جو نمائندے شریک ہوئے انکی رہائش و خورد و نوش کا انتظام مقامی کمیٹی کے سپرد تھا۔ اس عظیم الشان تاریخی کانفرنس میں تحریک خلافت کے ہر پہلو پر غور و فکر کر کے تبادلہ خیالات ہوا۔ میجر جیمز ڈپٹی کمشنر ہزارہ کے استبداد کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کیا گیا۔ جو اس نے مجاہد ملت حضرت مولینا محمد اسحٰقؒ اور رئیس الاحرار حضرت مولینا ابو المعارف محمد عرفان صاحب اور دیگر خدام خلافت کمیٹی سے روا رکھا۔ اور تحریک خلافت کے محبوب قائدین کی گرفتاری باشندگان ہندوستان کے جذبات مجروح کرنے کے مترادف ہے کہ جب تک مسلمانوں کے مقتدر مذہبی رہنما اور ان کے مددگار و معاون رہا نہیں کئے جاتے حقیقی امن بحال نہیں ہو سکتا۔ میجر جیمز کے ظالمانہ رویہ کے خلاف صدائے

احتجاج کرتے ہوئے واشگاف الفاظ میں صاحب موصوف قائدین کے مؤقف کی تائید کی اور ملک کے گوشے گوشے سے ان کی گرفتاری کے خلاف احتجاج کے طور پر اجلاس ہونے شروع ہو گئے۔ اس تشویش کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے سینکڑوں مقامات سے یہی آواز بلند ہوئی۔

پنجاب کی قطع و برید سے تقسیم بنگال کی طرح لارڈ کرزن کے پیش نظر ایک شیطانی مقصد تھا۔ بنگال کے مشرقی حصہ کی آبادی کا جزو غالب مسلمان تھے۔ اور چونکہ تعلیم میں پسماندہ ہونے کے باعث وفاداری کی وہی پرانی لکیر پیٹتے چلے آتے تھے جسے مغربی بنگال کی بیداری مٹا چکی تھی۔ اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلاف کا وہ ستون جو برطانیہ کی مشرقی حکمت عملی کو استوار کئے چلا آتا تھا۔ مرکز ثقل سے نہ ہٹتا۔ اس لئے امید ہو سکتی تھی کہ وفاداران ازلی اور شوریدگان سرمدی کی کشاکش اغراض کے صدقے میں حکومت کا الو بدستور اپنے اڈہ پر بیٹھا رہے گا۔ علیٰ ہذا القیاس پنجاب کے علاقہ شمال و مغربی کے پچانوے فیصدی بسنے والے بھی جاہل اور ناتربیت یافتہ مسلمان تھے جو نہ صرف لالہ لاجپت رائے اور اجیت سنگھ جیسے مفسدہ پردازوں کی ناطبوع سرگرمیوں کے رد عمل کا آلہ کار بنائے جا سکتے تھے۔ بلکہ مشرق وسطیٰ کے اس بساط شطرنج کے پٹے ہوئے مہرے کا کام دے سکتے تھے جو روس اور برطانیہ کے کشور کشا شاطروں کے درمیان بچھی ہوئی تھی۔ بنگالیوں کی فلک شگاف غلغلہ اندازی کا تو لارڈ کرزن سے کوئی علاج نہ بن پڑا۔ اور شاہ جارج پنجم اپنی تاجپوشی کی تقریب پر وارد ہندوستان ہوئے تو انہوں نے بنگال کے الحاق کے اعلان سے اس بے چینی کو رفع کر دیا۔ لیکن صوبہ سرحد کے بے زبان مسلمان جو شور مچانے کے فن سے مطلقاً ناآشنا تھے۔ اور بجز خدا اور رسولؐ کے ان کا کوئی وارث نہ تھا۔ لارڈ کرزن کی حکمت عملی کے میدان کا فٹ بال بنے ہوئے جس طرح تقسیم کے وقت سے ٹھوکریں کھاتے چلے آتے تھے۔ بدستور عشق سراپا بنے

رہے اور اب تک بنے ہوئے ہیں۔

لارڈ کرزن کا شمار برطانیہ کے ان مدبّرین میں ہوتا ہے جنہوں نے روس کی سرگرمیوں کو ہمیشہ خوف و کراہ کی صورت میں دیکھا ہے۔ اگر ان کی قسمت میں آگے چل کر مسٹر ملائڈ جارج کی خواجہ تاشی لکھی تھی۔ جو اپنی اسلامی حکمت عملی کے علاوہ باقی تمام مسائل میں پینڈے کی ٹھلیاں ثابت ہو چکے ہیں۔ لیکن تقسیم پنجاب کے وقت ان کی سرحدی حکمت عملی کا خلاصہ صرف اس قدر تھا۔ کہ افغانستان کو برطانیہ کا وظیفہ خوار غلام بنا کر روس اور ہندوستان کے درمیان لوہے اور دیوار کی طرح کھڑا کر دیا جائے۔ افغانستان اور ہندوستان کے درمیان سرحدی قبائل کی سنگین دیوار تعمیر کی جائے قبائل کو بیش قرار وظیفے دے کر رام کر لیا جائے۔ وظائف کی تقسیم میں اس اصول کو مدنظر رکھا جائے کہ قبائل آپس میں ہمیشہ لڑتے جھگڑتے رہیں اور متحد نہ ہونے پائیں۔ صوبہ سرحد ان قبائل اور ہندوستان کے درمیان آخری پشتے کی طرح ہو۔ کہ اگر قبائل غارت گرانہ فطرت کا دریائے ذخار پشتے کو توڑ کر ہندوستان کی طرف بہنے لگے تو پہلے سیلاب کی زد صوبہ سرحد کی سرزمین پر پڑے۔

صوبہ سرحد پر اس حکمت عملی کا جو اثر ہوا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ تمام وہ بدعنوانیاں جن کی ذمہ داری سرحدی قبائل کی بے چین فطرت پر عائد ہوتی ہے صوبہ سرحد کے مظلوم باشندوں کی کوتاہیوں کی فہرست میں درج کر لی گئیں۔ ان بیچاروں کو ان تمام ناکامیوں، ہزیمتوں اور سختیوں کا خمیازہ بھگتنا پڑا جو جان بل کو اپنی سرحدی حکمت عملی کی وجہ سے پیش آنی ناگزیر تھیں۔ آج کل حالت یہ ہو رہی ہے کہ ضلع پشاور کا ایک باشندہ کسی گاؤں میں جا کر کسی گھر میں نقب لگاتا ہے۔ اور دوران نقب زنی میں اہل خانہ میں سے کسی کو اپنے سامنے پا کر قتل کر دیتا ہے اور پھر سرحد کو عبور کر کے علاقہ غیر میں چلا جاتا ہے۔ پولیس موقعہ پر پہنچتی ہے اور تفتیش کے بعد

مجرم کا سراغ نہیں لگا سکتی۔ تو اس کے لگے بندھوں کو شبہ میں پکڑ لیتی ہے اور اپنی خفیہ و علانیہ تحقیقات کی بناء پر ملزموں کو خاطی قرار دیتے ہیں اور پھر ان کو چودہ چودہ سال کیلئے جیل میں بھیج دیا جاتا ہے یہ ناکردہ گناہ چودہ سال تک جیل میں سڑگل کر جب آزاد ہوتے ہیں۔ تو حکومت کے انصاف اور اپنے ابنائے جنس کی دیانت کی جانب ان کے غیظ آلود دلوں میں یاس و قنوط کی کیفیت طاری ہوتی ہے اور ان کی سب سے بڑی آرزو یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنے مخالفوں سے اپنی مظلومیت کا انتقام لیں۔ جو پھر قتل کی صورت اختیار کرتا ہے۔ اور قاتل فرار ہو کر علاقہ غیر میں چلا جاتا ہے۔ پولیس پھر وہی پہلی سی حرکت کرتی ہے بیگناہ پھانسے جاتے ہیں اور یہ سلسلہ لامتناہی برابر جاری رہتا ہے۔

ان جرائم کی پاداش میں جن کے داغ سے ان بیچاروں کا دامن شاید بالکل پاک تھا دس دس بارہ بارہ سال کیلئے قید کر دیئے جاتے ہیں۔ قید سے چھوٹ کر یہ شیران بیشہ آزادی اپنے وطن کو واپس جاتے ہیں تو اپنے ابتلاء حق کی دردبھری داستان سے اپنے خویش و اقارب کے جذبات انتقام بھڑکاتے ہیں۔ اور انگریزی حکومت کو اپنے عاقبت نا اندیش عمال کی نالائقی کی قیمت کئی لٹے ہوئے گھروں اور کئی قابل قدر اسیروں کی شکل میں ادا کرنی پڑتی ہے۔ یہ تو قانون اور ضابطہ کا وہ اندازہ ہے۔ جس سے عوام کو سابقہ پڑتا ہے۔ رہے خواص سو چند ابن الوقت جاہ پرستوں کو چھوڑ کر جو سقوط بغداد پر اپنے گھروں میں چراغاں کرتے دیکھے گئے۔ اور ترکوں کی شکست پر چیف کمشنر کو مبارک دیتے سنے گئے۔ باقی جس قدر حق پرست اور آزاد رو حضرات ہیں۔ ان کی حالت یہ ہے کہ سچی بات منہ سے نکالی اور پکڑ لئے گئے۔ انگریز کو سلام نہ کیا اور مارے گئے۔ نواب ٹانک جن کا جرم اس کے اور کوئی جرم نہیں کہ انہوں نے حضرت خلیفۃ المسلمین کے ساتھ اپنی دلی ارادت کا اظہار بلند آہنگی

سے کیا تھا۔ سال با سال سے انگریزوں کی کال کوٹھڑی میں بند کئے گئے خان بہادر عبدالرحیم خان رکن مجلس وضع آئین و توانین کے برادر حقیقی عبدالحکیم خان مغفور بیرسٹر (بار ایٹ لا) صرف اسی خطا پر کہ اغوا کے ایک مقدمے میں انہوں نے اپنے موکل کے حقوق کی حمایت کرتے ہوئے میجر اسٹوارٹ کی مزاج پرسی کا فرض مقدس ادا نہ کیا۔ اڑتالیس گھنٹے کیلئے جیل میں بند کردیئے گئے۔ اور خود جناب خان بہادر جو ان دنوں حکومت کی برکات وحسنات کی قصیدہ خوانی پر مامور تھے خود ارشاد فرماتے کہ آپ کے ساتھ کیسا سلوک ہوا۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ ایک مرتبہ نئی نئی ترنگ میں آکر ایک انگریز کو سلام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ تو آپ کا پانی بند کر دیا تھا۔ اور آپ سفر عراق کی زحمت گوارا کئے بغیر گھر میں بیٹھ کر کربلائی بن گئے۔ لیکن یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب آپ اپنے یاران سرخیل کے حلقے میں فخریہ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ

"بھئی! ہم تو زمین کفر میں اسلامی جھنڈا گاڑنے کے قائل ہیں!"

اب شاید یہ جھنڈا سرنگوں ہو چکا ہے۔ اس لئے آپ کا سر مبارک بھی جھکا ہوا نظر آتا ہے۔ تو یہ مقام تعجب نہیں۔

۵

سپہر آں بساط کہن را نوشت
بساط دگر ملک را تازہ گشت

اب تو بادل ناخواستہ لارڈ کرزن کو بھی گاڈفرے نیل کی طرح منطق کے اس کلیہ کی ہمہ گیری کا معترف ہونا پڑا۔ کہ "العالم متغیر" لیکن جس زمانے میں آپ "لندن ٹائمز" کے نامہ نگار کی حیثیت سے اپنی مشہور کتاب "پرشیا" کا مواد بہم پہنچانے میں مصروف تھے۔ بلکہ اس زمانے میں بھی جو ہندوستان کے نائب السلطنت ہونے کے لحاظ سے آپ کی بوقلموں زندگی کا نمایاں ترین حصہ ہے۔ آپ کم از کم ایشیا کو اس کلیہ کی مستثنیٰ

استشنائی تصور فرمانے کے خوگر تھے۔ اپنی مایہ ناز تصنیف میں نہایت متانت سے ارشاد فرماتے ہیں کہ مشرق غیر تغیّر پذیر ہے۔ مشرقیوں کی سرشت کا خمیر جمود و سکون کی خاک سے اٹھایا گیا ہے۔ جس طرح ان لوگوں کے پہاڑوں اور بیابانوں کی ہیئت کذائی میں قدیم الایام سے کوئی فرق نہیں آیا۔ اسی طرح ان کا طرز ماند و بود، انداز فکر اور وضع گفتار و کردار آج بھی وہی ہے جو ابراہیم علیہ السّلام کے وقت میں تھی۔

مشرق اور اہل مشرق کے ناقابل تغیّر ہونے کا یہی وہ انوکھا تصور تھا۔ جس کے سانچے میں لارڈ کرزن نے اپنی سرحدی حکمت عملی کو ڈھال کر سمجھ لیا کہ دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے لیکن جس سر بفلک عمارت کی داغ بیل وہ ڈال چکے ہیں وہ ابدالآباد تک اپنی جگہ کھڑی رہے گی۔ روس کا نظام شہنشاہی ہمیشہ برطانیہ کا ایشیائی رقیب بنا رہے گا۔ کابل کٹھ پتلی کی طرح ہمیشہ شملہ کی روپہلی پر ناچا کرے گا۔ سرحدی قبائل کی دیرینہ رقابتیں ہمیشہ برطانوی مداخلت کی آلہ کار بنی رہیں گی۔ ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی روایتی کش مکش سرحدی خطرے کی باہمی اور بے محل نمائش ہے، قیامت تک برقرار رکھی جا سکے گی۔ لارڈ کرزن پر ہی کیا موقوف ہے انگلستان کے اکثر اہل الرائے مدبران تمام فنی احتمالات کو یقینیات کی حد تک پہنچا ہوا سمجھنے لگے تھے۔ اور تو اور لارڈ مارلے جیسے نکتہ رس فلسفی پر بھی ان خیالات باطلہ کا اثر پڑے بغیر نہ رہا۔ چنانچہ لارڈ منٹو کی شرکت میں آپ برطانیہ کے خوان کرم سے ہندوستان پر وہ چند ریزے بکھیر چکے۔ جو "منٹو مارلے اصلاحات" کے سیاسی نام سے موسوم ہیں۔ اور بعض احرار نے ان "اصلاحات" کو ناکافی بتایا۔ تو وزیر ہند نے ماتھے پر شکن ڈال کر بکمال تحیّر کہا:

"اس سے زیادہ پانچ سو سال تک بھی اہل ہند کو اور کچھ نہیں دیا جا سکتا"

تقدیر پردے کے پیچھے کھڑی ہوئی سفید پتلیوں کی اس مضحکہ خیز نقالی پر ہنس رہی تھی اور مشرق و مغرب کی نگاہ سے اوجھل اپنے جلو میں جادو کی وہ چھڑی تیار کر رہی تھی

جس کی ایک ہی ضرب میں کرزن، مارلے، ہارڈنگ، گرے، چرچل اور لارڈ جارج کے خیالی قلعے پاش پاش ہو جانے والے تھے۔

کارفرمایانِ قضا و قدر کی نیرنگ نوازی کا پہلا کرشمہ سر ایڈورڈ گرے اور موسیو سازوناف کی وہ مشہور قرار داد تھی۔ جسے لارڈ ہارڈنگ کی سیاسی قلابازی نے پایۂ تکمیل کو پہنچایا، جو عرف عام میں "معاہدہ برطانیہ و روس" کہلاتا ہے۔ اور جسے انگلستان کی جدید مشرقی حکمت عملی کا سنگِ بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس حکمت عملی کے صرف دو اغراض ہیں۔ مشرقی اقوام کی آزادی کا استیصال اور اسلام کی تباہی۔ برطانیہ کی وزارت خارجہ نے اس معاہدے کو علانیہ اور خفیہ دفعات میں "نصف کل" کے اصول پر ایران کو انگلستان اور روس کے درمیان بانٹ کر اور قسطنطنیہ کو اشراقی انداز میں نکولس ثانی کی میراث تسلیم کر کے بزعم خود ہندوستان کو روسی خطرے سے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیا۔ اور اپنی عادت سے مجبور ہو کر جب تک کسی کی دوستی سے کوئی مطلب نکلتا ہے۔ اس کے ساتھ تلطف اور خوشامد کا سلوک کیا جائے۔ لیکن جب مطلب براری کی توقع نہ رہے تو اس کی طرف سے طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لی جائیں۔ حکومت افغانستان کے پاس جسے اس روسی ساز باز کے متعلق مطلق علم نہ تھا۔ جب یہ دفعات بغرض تصدیق پہنچیں تو اس کے غم و غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اور چونکہ مظلوم ایران کی طرح وہ بے دست و پا نہ تھا۔ اس غیرت نے ہمسایہ فروشی کی اس قساوت کو نفرت و حقارت کی ٹوکری میں جھونک دیا۔ بیسویں صدی کے پہلے تیرہ سال کے واقعات پر جن ارباب بصیرت کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ ایران کی سیاسی و اقتصادی بربادی، انقلاب ترکی کے ساتھ ہی ہرزگووینا کا خلافت عثمانیہ کی گرفت سے نکل جانا، بلغاریہ کا عثمانی سیادت سے آزاد ہو جانا، طرابلس پر اطالویوں

کا چھاپہ مارنا، بلقانی ریاستوں کا متحد ہو کر ترکی پر حملہ کر دینا اور ترکی کے یورپین مقبوضات کا گھٹتے گھٹتے خطۂ ریناس ہیڈ یا تک سمٹ آنا، افغانستان میں ایک نئی زندگی کا پیدا ہونا، سرحدی قبائل کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا رفتہ رفتہ بڑھتے جانا، ہندوستان بھر میں ایک فقیدالمثال انقلاب کی روح کا پیدا ہونا سب اسی معاہدہ روس و برطانیہ کے نتائج ہیں۔ دنیا مبہوت و ششدر بنی ہوئی قدرت کا تماشا دیکھ رہی تھی۔ کہ ساحرِ تقدیر نے اپنے جھولے سے ایک ان دیکھا ترنج نکال کر اچھالا جو فضا میں دور جا کر پھٹا اور اس کے پھٹنے سے سارا جہان تیرہ و تار ہو گیا۔ امریکہ و یورپ، افریقہ و ایشیا کے لئے اس کا مہیب تڑاکا ایک بھونچال تھا جس کے بطش شدید کی گرفت میں قومیں بید لرزاں کی طرح کانپنے لگیں۔ خیر و شر کی وہ قوتیں جن میں مبدأ فیاض کی ازلی و سرمدی مصلحتوں نے ارتقاء بنی آدم کے مقصد نہانی کی تکمیل کیلئے وضع کیا ہے آپس میں ٹکرا گئیں۔ اور اس تصادم کے آثار ابھی دنیا تک مٹتے نظر نہیں آتے۔

سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم جس نے رومینیا، ہانسبرگ اور ہوہن زولرن جیسے باجبروت شہنشاہی خاندانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا کر زار روس تاجدار ہسٹریا و ہنگری اور قیصرِ جرمنی کے تخت الٹ دیئے۔ جس نے اژدھام توپوں، فلک پیما طیاروں، آبدوز جہازوں، آہن پوش بیڑوں اور زہر پاش کاروں کے ابلیسی حربوں سے کروڑوں انسانوں کو خاک و خون میں سلا دیا۔ بعض مغربی فلاسفر کی رائے میں شہنشاہیت اور جمہوریت کی جنگ تھی۔ مصارف پرستانہ نخوت اور امن پسندانہ قناعت کی جنگ تھی۔ یہ رائے ایک حد تک درست ہے۔ لیکن ہم مشرقیوں کے نزدیک یہ جنگ دراصل برطانیہ کے جہانگیرانہ اقتدار اور جرمنی کی کشور کشایانہ سرگرمیوں کی باہم آویزش سے شروع ہوئی اور جرمنی کی شکست کے بعد یونانی اصالیب اور عثمانی ہلال کی آویزش میں بدل گئی۔ جس کا سلسلہ ابھی تک قائم ہے۔

اس عالمگیر معرکہ میں دنیا کی بیسیوں چھوٹی بڑی طاقتیں جرمنی کے بالمقابل برطانیہ کے دوش بدوش مصروفِ پیکار نظر آتی ہیں۔ امریکہ، فرانس، اٹلی، روس، جاپان جیسی دول قاہرہ سب اس کی حلیف تھیں۔ اور سب کی متفقہ قوت سے عہدہ برآ ہونا جرمنی کے لئے محال تھا۔ ضرورت کے وقت بیگانوں کو یگانے بنانے کا فن جیسا انگریزوں کو آتا ہے۔ کسی کو کم آتا ہوگا لیکن کام نکال لینے کے بعد وہی قوم جسے گدھے کو بھی باپ بنانے میں تامل نہ تھا۔ اپنے پرانے دوستوں کو دیکھ کر ایسی انجان بن جاتی کہ گویا کبھی کی جان پہچان ہی نہ تھی۔

جس طرح انگریزوں کا قومی نام جان بل ہے اسی طرح امریکہ والے " انکل سام " کہلاتے ہیں (یعنی چچا سام) اگر اپنے بھتیجوں کی مدد کے لئے عین وقت پر نہ پہنچتے۔ تو ایک دنیا جانتی ہے کہ ان کی خیر نہ تھی۔ جب تک جنگ کا پانسہ پلٹنے کے لئے امریکہ کی فوجیں، امریکہ کا روپیہ، امریکہ کے ذخائر رسد ناگزیر رہتے رہے چچا سام سعادت مند بھتیجوں کی بھری چوپال کے مکھیا بنے رہے۔ ان کے ہر فقرہ پر تحسین و آفرین کے پھول برستے تھے۔ ان کے ہر قول پر اقوام عالم کی قسمتوں کے فیصلے کا گمان ہوتا تھا۔ صدر ولسن کے چہاردہ گانہ اصول حریت عالم کے آگے برطانیہ کا سر سب سے زیادہ جھکا ہوا نظر آتا تھا۔ اگرچہ مسٹر لائیڈ جارج جھکے ہوئے سر کے ساتھ دبی زبان میں نغمہ بھی گنگناتے تھے

پڑا ابھی تجھے برطانیہ سے کام نہیں
چچا بنا کے نہ چھوڑوں تو جارج نام نہیں

جرمنی کے سپر ڈالتے ہی مسٹر ولسن کی چودھراہٹ بھی گاؤ خورد ہو گئی۔ اور ان کے چودہ اصول بھی گدھے کے روایتی سینگوں کی طرح اڑ گئے۔ چچا سام جنہیں ثالث بالخیر بننے کی ہوس اپنے کنج عافیت سے کشاں کشاں میدان جنگ تک

لے آئی۔ اپنے جمائے اڈے پر برخوردار سعادت اطوار لائیڈ جارج کو جما ہوا دیکھ اور ثالثی کے خالی خولی اعزاز سے بھی اپنے آپ کو محروم پا کر دانت پیستے ہوئے الٹے پاؤں تشریف لے گئے۔ اور اب جلے دل کے پھپھولے زاند از ضرورت جنگی جہاز بنانے اور کروڑوں روپیہ آئرلینڈ کے انقلاب پسندوں کی نذر کرنے سے پھوڑ رہے ہیں۔

برطانیہ کی شان جہان کشائی برقرار رکھنے کیلئے سب سے زیادہ سرفروشانہ جدوجہد روس نے کی لیکن اس جاں نثاری کا جو نتیجہ اس بدنصیب سلطنت کو ملا۔ وہ فسانہ عالم کا سب سے زیادہ عبرتناک باب ہے۔ جب تک ٹمن برگ کی قربان گاہ پر روسیوں کے خون کا چھڑکاؤ ہوتا رہا، جب تک پری مسل کی خندقیں روسیوں کی لاشوں سے پاٹی جاتی رہیں، جب تک وارسا اور بخارسٹ میں روسی سپاہی بینڈ برگ اور میکسن کی توپوں کا کھاجا بنتے رہے، جب تک باطوم سے لے کر باکو تک روسی لشکر کی گردن انور پاشا کی شمشیر بے پناہ کو صلائے قطع و برید دیتی رہی، سینٹ پیٹر برگ لندن کی آنکھوں کا تارا بنا رہا۔ لیکن جب ان خوفناک قربانیوں کی اصل سے واقف ہو کر امراء روس نکولس اور اس کے اہل و عیال کا پرغرور سر اسی تلوار سے اڑایا۔ جو صدیوں سے ان کے سر پر معلق چلی آتی تھی تو برطانیہ کو اس یار غار کی تربت پر چڑھانے کے لئے دو پھول بھی میسر نہ آئے۔

زار کے سپرد خاک ہوتے ہی وہ نظام استبداد بھی مٹی میں مل گیا۔ جو انگریزی شہنشاہیت کے ساتھ یارانہ گانٹھ کر قسطنطنیہ و طہران کے سینہ کے حق میں کابوس کا حکم رکھتا تھا جس کی ہیبت سے افغانستان لرزہ براندام تھا۔ اور چین و جاپان نے چین کو بے چین کر رکھا تھا۔ نکولس کے امریکہ جلال پر لینن متمکن ہے جس کے ایک ہاتھ میں گرے کے پھٹے ہوئے معاہدے کے پرزے ہیں۔ اور دوسرے ہاتھ میں کرزن کی برطانوی و ایرانی دو ورقی کرمیہ سازی ناف کی لٹی ہوئی دولت نے جو ترکہ "ڈاؤننگ سٹریٹ"

کے لئے چھوڑا تھا وہ تراشکی اڑا لے گیا سبحان اللہ ذی الکبریاء والجبروت ؎

گرچنیں ناز تو آمادۂ یغما ماند
بسکندر نرسد آنچہ ز دارا ماند

مجاہد ملت حضرت مولٰنا محمد اسحٰق اور رئیس الاحرار ابوالمعارف مولٰنا محمد عرفان کی گرفتاری کے باعث درد مند حضرات کے زخم ابھی بھرے نہ تھے کہ خدام خلافت پر نئی مصیبت نازل ہوئی۔ کہ ۴ر دسمبر ۱۹۲۰ء کو علی گوہر خان صاحب سکنہ تاتار سیکرٹری انجمن اسلامیہ بکھلی و وائس پریذیڈنٹ خلافت کمیٹی مانسہرہ اور مولوی غلام ربانی صاحب سیکرٹری خلافت کمیٹی کو روپیہ بھیجنے کی بناء پر ڈپٹی کمشنر ہزارہ نے بذریعہ پولیس طلب کیا۔ اور احمد خان پسر حاجی محمد اکبر خان جاگیردار گیدڑپور اور فقیر خان نمبردار ملک پور استغاثہ کی طرف سے کھڑے ہوئے اور کہا کہ ہم مرکزی خلافت کمیٹی کو روپیہ دینا نہیں چاہتے۔ انہوں نے مسلمانان تحصیل مانسہرہ سے جمع کردہ رقم مبلغ تین ہزار روپیہ ڈاک خانہ سے برآمد کر کے مسٹر چھوٹانی صدر خلافت کمیٹی ہندوستان کو بذریعہ تار بمبئی بھیج دیا ہے۔ بلکہ یہ روپیہ ہم کو برائے اجرا ہائی سکول مانسہرہ دلایا جائے۔ علی گوہر خان صاحب سے ضمانت طلب ہوئی۔ اور انکار کر دینے پر زیر حوالات رکھے گئے۔ اور باوا اسکھراج (یعنی باوا پریال سنگھ) جو کہ تحریک خلافت کے ایام میں جامع مسجد مانسہرہ کے منبر پر کھڑے ہو کر تحریک کے مؤقف میں تقریر کرتا تھا گو کہ اس کا رویہ ہمدردانہ تھا۔ جب ڈپٹی کمشنر ہزارہ نے اس کو دھمکی دی۔ تو کہنے لگا۔ کہ "حضور! ہماری مثال آٹے کے دیا کی سی ہے۔ آپ مکان کے اندر رکھیں تو چوہے کھا جائیں گے۔ اگر باہر رکھیں تو کاں (کوے) لے جائیں گے۔" یعنی یعنی یہ خوانین حضرات زبردست لوگ ہیں ہم ان کے ڈر کے مارے ان سے تعاون پر مجبور ہوئے۔ یہ ہندو قائد کی ذہنیت کی عکاسی ہے۔ بہر حال وہ خوش اخلاق اور رفیق

معیبت رہا۔ بادا سکھراج کے علاوہ خلافت کمیٹی کے دوسرے عہدیداران اور ممبروں کو ضمانت پر چھوڑ دیا۔ مولوی غلام ربانی صاحب کو بھی دس دسمبر کی شب کو سپرد حوالات کر دیا گیا۔ اس سے پہلے یکم دسمبر کو مولوی غلام نبی صاحب پیش امام جامع مسجد گیدڑ پور سے شرکت جلسہ جمعیت العلماء دہلی کے جرم کی پاداش میں زیر حوالات رکھ کر ضمانت طلب کر لی گئی۔ حالانکہ صاحب موصوف اپنے استاد شیخ الہند مولنا محمود الحسن صاحب دیوبندی کی بیمار پرسی کیلئے دہلی گئے تھے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہزارہ کا تشدد و ظلم انتہائی درجہ کو پہنچ چکا تھا۔

ے

ہے ظلم ترا عام مگر پھر بھی ستمگر
مخصوص یہ انداز جفا مرے لئے ہے

چیف کمشنر سرحد کا جذبۂ انتقام

سرحدی گورنمنٹ کی عجیب و غریب کارفرمائیوں پر اگرچہ "زمیندار" اخبار کے صفحات میں بہت کچھ روشنی ڈالی گئی تھی لیکن اس زلف کی درازی کسی بدنصیب عاشق کی شب ہجراں سے بھی طویل تھی ے

باشندگان سرحد سر جارج روس کیپل سابق چیف کمشنر سے نالاں تھے مگر جناب "گرانٹ" تھے کہ انہیں "بخشوانے" پر تلے ہوئے تھے۔ لوگوں کی تمنا تھی کہ نرمی برتی جائے۔ ملاطفت سے کام لیا جائے۔ کہ خلافت کی تباہی ہی زخموں کی نمک پاشی کے لئے کیا کم تھی۔ کہ وہ بھی رعایا کے پیچھے پنجے جھاڑ کر اور ہاتھ دھو کر پڑ گئے۔ بس یہی معلوم ہوتا تھا کہ ظلم و تشدد اور جبر و استبداد پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں ـــــ انسان فطرتاً اپنے عیوب کے افشا اور اپنے گناہوں کے اظہار سے خوف کھاتا ہے۔ اور نہیں چاہتا۔

کہ اس کی بُرائیاں برسرِ عام آئیں۔ مگر اللہ رے بے نیازی سر جان گرانٹ کے کانوں پر جوں بھی نہیں رینگتی تھی۔ کوئی لاکھ بُرا کہے وہ اپنی ستم آرائی سے باز آنے والے نہ تھے۔ خیال تھا کہ "زمیندار" کے مضامین اور وہ مناقب و فضائل جو "زمیندار" کے کسی سرحدی نامہ نگار نے لکھے تھے، چیف کمشنر کے لئے تازیانۂ عبرت ہوتے۔ اور آئندہ اپنے طرزِ عمل کو درست کرنے کی کوشش فرماتے لیکن قطب اپنی جگہ سے کب ٹلا ہے۔ کہ یہ حضرات راہِ راست پر آتے۔

"راج ہٹ" مشہور ہے۔ اور اس کے صحیح مصداق تو اوڈوائر تھے یا وہ تھے جو اس وقت سرحد کی چیف کمشنری کی کرسی پر براجمان تھے مسٹر امیر چند بموال کے احکامِ نظربندی کی تنسیخ، مسٹر عبدالغفار خان، ڈاکٹر بی سی گھوش، حکیم عبدالجلیل ندوی، سردار ملاپ سنگھ اور دیگر محبانِ وطن کی ضمانت سے آزادی کے بعد خیال ہُوا کہ شاید عقل ٹھکانے پر آئے گی۔ اور آئندہ ہوش کے ناخن لے جائیں گے۔ مگر

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

پشاور میں ہر سال وکلاء کی طرف سے وکالت کی اجازت حاصل کرنے کیلئے درخواستیں پیش کی جاتی تھیں۔ دیگر صوبجات ہند کی طرح یہ نہیں تھا کہ کسی وکیل کو پریکٹس کی اجازت دینے کے لئے اس کی سندِ وکالت ہی کافی تصور کی جاتی۔ بلکہ چیف کمشنر اور جوڈیشنل کمشنر اپنے اختیارِ تمیزی سے کام لیتے تھے۔ جسے وہ چاہتے تھے اسے اجازت دی جاتی تھی۔ اور جو ان کی طبعِ نازک پہ گراں گزرتا اسے محروم رکھا جاتا تھا انتخاب کیلئے کوئی خاص معیار نہیں تھا۔ البتہ جس کی زیادہ سفارشیں تھیں وہ ناکام نہیں ہوا۔ مگر کوئی بدنصیب سفارش نہ رکھتا تھا۔ یا چیف کمشنر اور جوڈیشنل کمشنر کو خوش نہ کر سکتا تھا۔ تو وہ کامیابی کا منہ نہ دیکھ سکا۔ صاحبان موصوف عموماً اپنے اس اختیارِ تمیزی کو نہایت لغویت کے ساتھ استعمال کرتے تھے۔ اور اس

سے بے حد ناجائز فائدہ حاصل کرتے تھے۔

مسٹر رادھاکشن بی اے ایل ایل بی وکیل پشاور جو خداداد قابلیت کے مالک تھے اور قدرت کی طرف سے ذہن رسا ودیعت کیا گیا تھا۔ اور مدت سے پشاور میں کامیابی کے ساتھ وکالت بھی کرتے رہے۔ جن کے کافی شناسا دوست یار تھے۔ گو وہ اپنے ذاتی رسوخ کی بدولت کافی سفارشیں کر سکتے تھے۔ اور گویا ان کے لئے بہت سے "رائے بہادر" چیف کمشنر اور جوڈیشنل کمشنر کے آستانہ اقدس پر جبہ سائی کے لئے آمادہ تھے۔ لیکن اس غیور نے یہ مناسب نہ سمجھا۔ کہ ایک امر کے لئے جسے وہ اپنا حق سمجھتا ہے۔ کسی خطاب یافتہ کا مرہون منت ہو۔ غلطی سے ان کو گورنمنٹ پر اعتماد تھا۔ اور وہ سمجھتے تھے کہ سرکار والا کسی کے حق کو غصب نہیں کرتے

باشندگان صوبہ سرحد کی خوش قسمتی سے کرنل ویج ووڈ صوبہ سرحد کے حالات معلوم کرنے کے لئے ۱۴ر نومبر سنہ ۱۹۲۰ء کو پشاور تشریف لائے۔ مسٹر رادھاکشن موصوف سے کرنل ویج ووڈ کی مجلس استقبالیہ کے سیکرٹری تجویز کئے گئے۔ اور انہوں نے اس خدمت کو قبول کرکے تندہی اور جانفشانی سے کام کیا۔

یہ گناہ ایسا نہ تھا جس کو چیف کمشنر ٹھنڈے دل سے برداشت کر سکتے تھے انہوں نے دل میں ٹھان لی کہ مسٹر رادھاکشن سے انتقام لیا جائے۔ اور نیز انہیں ایسا سبق دیا جائے کہ وہ پھر کبھی ایسی حرکت نہ کریں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اور مسٹر رادھاکشن کو وکالت کی اجازت نہ دی گئی۔

چیف کمشنر خوش تھے کہ ہم نے رادھاکشن کو کافی عبرت انگیز سزا دی۔ اور وہ آئندہ خاموشی کے ساتھ زندگی بسر کریں گے۔ لیکن قدرت ان کے خیال پر خنداں تھی۔ اور فطرت ان کی مسرت پر مضحکہ کر رہی تھی۔

چیف کمشنر مبارک باد کے مستحق تھے۔ کہ انہوں نے اپنے احباب کے زمرے میں ایک اور دوست کا اضافہ کر دیا تھا۔ کیونکہ رادھاکشن نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنا تمام وقت ملک و وطن کی خدمت میں صرف کریں گے کہ

ع بڑھتا ہے اور شوق گریہ سزا کے بعد

ع خدا شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد

نوٹ:۔

"تحریک خلافت" کے عنوان کے تحت راقم الحروف نے جن پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ اکثر مؤرخین نے اس طرف توجہ نہیں دی۔ مقام افسوس ہے کہ اللہ بخش یوسفی صاحب مصنف "سرحد اور جد و جہد آزادی" کی کتاب مرکزی اردو بورڈ ۲۲ جی گلبرگ لاہور سے شائع ہوئی۔ اس میں ابوالمعارف مولانا محمد عرفان کو مناسب مقام نہیں دیا گیا۔ حالانکہ مصنف موصوف ان کے حلقۂ احباب میں سے تھے۔ اور مرکزی خلافت آل انڈیا بمبئی شہر میں ان کے ساتھ طویل عرصہ اکٹھے کام کیا ہے۔ سب کچھ جاننے کے باوجود تعصب سے کام لیا ہے۔

اسی طرح مولانا محمد اسحٰق کے متعلق بھی چنداں وضاحت سے ذکر نہیں کیا گیا۔ بلکہ "تحریک خلافت" میں اپنی ذات اور اپنے ضلع کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

راقم الحروف نے "تحریک خلافت" کے جتنے اوراق ترتیب دیئے ہیں اگر کسی کو شبہ ہو تو مولانا ظفر علی خان کے روزنامہ "زمیندار" لاہور کے تحریر کردہ واقعات ملاحظہ فرمائیے۔ اور بیشتر واقعات ایڈیٹر

روزنامہ "زمیندار" نے "اداریوں" کی صورت میں رقم کئے ہیں جو کہ درج ذیل ہیں:۔

روزنامہ "زمیندار" لاہور

یکم اپریل ۱۹۲۱ء

۲ر اپریل ۱۹۲۱ء

۳ر اپریل ۱۹۲۱ء

۴ر اپریل ۱۹۲۱ء

۵ر اپریل ۱۹۲۱ء

۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۱ء

۳۰ر اکتوبر ۱۹۲۱ء

۴ر جنوری ۱۹۲۱ء

۵ر جنوری ۱۹۲۱ء

۱۳ر جنوری ۱۹۲۱ء

۱۶ر جنوری ۱۹۲۱ء

۵ر مارچ ۱۹۲۱ء

۳۱ر اگست ۱۹۲۰ء

۱۶ر اکتوبر ۱۹۲۰ء

۱۷ر اکتوبر ۱۹۲۰ء

۱۸ر اکتوبر ۱۹۲۰ء

۱۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء

مخبروں کی کارستانی

تحریک خلافت ضلع ہزارہ میں جاری ہوئی۔ تو مندرجہ ذیل اصحاب نے ایمان کو پسِ پشت ڈال کر جھوٹے واقعات کی اطلاعیں اپنی سرکار کو پہنچائیں۔ یہ وہ ہیں کہ بغیر فرض منصبی کے محض سرکار کو خوش کرنے کی خاطر مخبری کر کے اپنے ایمان اور ضمیر کا خون کرتے ہیں۔ بعض اصحاب کو مقامی گورنمنٹ نے سندیں اور انعام دیئے۔ جس کی تفصیل ذیل ہے۔ اور ان مخبران و خیر خواہان سرکار کے اسمائے گرامی ذیل ہیں :۔

نمبر	نام	سلوک	کیفیت خدمات
۱	محمد عباس خان ولد خان بہادر حسین خان مانسہرہ	اس کو خلعت ملیگی	مخبری کرتا رہا اور ہجرت میں امداد دیتا رہا
۲	ہمایوں خان داماد خان بہادر حسین خان مانسہرہ	ایک سند اور پچاس روپیہ انعام	ممبران خلافت کے متعلق مخبری کرنا
۳	گلدیپ چند کلرک لالہ ایشر داس	ایک سند اور پچاس روپیہ انعام	مولنٰا محمد اسحٰق کے ڈیرہ پر بیٹھنا اور مخبری کرنا
۴	علی گوہر خان شاہ خیل گڑھی		خلافت کا حامی بنکر مخبری کرنا
۵	مردان علی شاہ ملازم خانصاحب گڑھی حبیب اللہ		مجالس خلافت اور دیگر معاملات کی مخبری کرنا
۶	مولوی عنایت اللہ کاگانی امام مسجد کاگان	پروانہ خوشنودی	تحریک خلافت کاگان میں مانع رہا اور اسکی ملیامیٹی پر ایک قصیدہ ڈپٹی کمشنر کی تعریف اور برطانیہ کے فضائل پر مرتب کرنا

نام	سلوک	کیفیت خدمات
۷۔ فیض طلب خان بٹل		عام مخبری کیا کرتا تھا
۸۔ مولوی غلام احمد راجدھاری علاقہ غیر		علاقہ غیر کی مخبری کیا کرتا تھا۔
۹۔ علی زمان ولد میر زمان پسران متولی ساکنان بٹل		مخبران سرکار ہیں
۱۰۔ عظمت اللہ ساکن چھپر گراں علاقہ غیر	ایک پستول انعام	عام مخبری ہر قسم کیا کرتا تھا۔
۱۱۔ عزیز اللہ ولد شریف اللہ ساکن ڈھوڈیال		مخبر اور ابن مخبر اور خوشامدی ہے
۱۲۔ رحمت اللہ ولد فقیر ساکن شنکیاری		لالچی اور مخبر بننے کا خواہاں ہے
۱۳۔ شاہداد خان ٹانڈہ	ایک سند اور پچاس روپیہ انعام۔	خلافت کی مخبری کرتا رہا
۱۴۔ حمید شاہ بھگکہ	ایک سند اور ۵۰/- روپیہ انعام	مجالس خلافت کی مخبری کرتا رہا۔
۱۵۔ عمر خان انعام خوار خاکی	ایک سند اور ۵۰/- روپیہ انعام	مجالس خلافت کی مخبری کرتا رہا
۱۶۔ منشی محمد زبیر ساکن ڈھوڈیال	ایک سند اور ۵۰/- روپیہ انعام۔	مجالس خلافت کی مخبری کرتا رہا
۱۷۔ خان بہادر عطا محمد خان والئی پھلڑہ		خلافت کی مخبری کرتا رہا۔
۱۸۔ اسمٰعیل خان برادر نوابصاحب والئی امب	ایک سند	ریاست کے معاملات کی مخبری کرتا رہا
۱۹۔ نور غلام پنشنر جمعدار نارتھن علاقہ غیر	ایک سند	علاقہ غیر کی مخبری کرتا ہے۔

نام	سلوک	کیفیت خدمات
۲۰۔ امین خان ساکن بٹگراں	ایک سند	علاقہ غیر کی مخبری کرتا ہے۔
۲۱۔ حاجت خان ساکن سیری	ایک سند	علاقہ غیر کی مخبری کرتا ہے
۲۲۔ گھنی شام ساکن شنکیاری پکھلی	شاید خلعت ملیگی	خلافت کی مخبری کرتا ہے
۲۳۔ رام چند شاہ ساکن بفہ	شاید خلعت ملیگی	خلافت کی مخبری کرتا ہے
۲۴۔ فقیر خان ساکن ملک پور	شاید خلعت ملیگی	ممبر خلافت اور حامی خلافت رہ کر مخبری کرتا رہا۔ اور یہی وہ شخص ہے۔ جس نے حصول سرمایہ خلافت کا دعویٰ کیا تھا۔

(روزنامہ "زمیندار" لاہور)

۵ مارچ سنہ ۱۹۲۱ء

ہزارہ میں جیمز شاہی

میجر جیمز ڈپٹی کمشنر ہزارہ نے ہزارہ خلافت کمیٹی کو ملیامیٹ کیا۔ اور کوہ سیاہ کے فرضی اور خیالی خطرہ میں گورنمنٹ کا بیشمار مالی اور جانی نقصان کر کے رعایا کے بے گناہ طبقہ کو گولیوں کا نشانہ بنایا۔ اور شہنشاہ معظم کی افواج قاہرہ کا جبروت و سطوت کا سکہ بٹھانے کی خاطر باشندگان علاقہ بالخصوص مسلمان و ہمدردان خلافت کو ہر قسم کے ناجائز وسائل سے ذلیل اور رسوا کیا۔ اور ان کی عزت وعظمت کو خاک میں ملا دیا۔ انہوں نے اپنی بے شمار بدعنوانیوں اور ظلم وستم اور تشدد آمیز کارروائیوں سے سر ہملٹن گرانٹ کو تاریکی میں رکھ کر اپنی من مانی مرادیں حاصل کیں۔ پھر وہ ضلع ہزارہ میں فوجی طاقت کی بدولت عارضی سکون سے پھولے نہیں سماتے تھے۔ اور اپنی اعلیٰ قابلیت کا اعتراف خود ہی کرتے پھرتے تھے بقول شخصے "ثنائے خود گفتن نمے زیبد"۔ اس کے ساتھ ہی بعض فرنگی اپنے سرنگی بھائی کی چالوں پر اظہار مسرت کرتے تھے۔ اور حکومت ہند نے اس وقت انہیں میجر جیمز کی سی۔ آئی۔ اے کے خطاب سے مزید حوصلہ افزائی کی تھی۔ اور اس کی ضدی طبیعت کو تیز کر دیا تھا

ع

بریں عقل، و دانش بباید گریست

ہمیں سر ہملٹن گرانٹ کی "عقلمندی" گورنمنٹ سے کوئی تعجب نہیں تھا۔ کیونکہ سر ہملٹن گرانٹ اپنی دماغی قابلیت سے معذور تھے۔ وہ میجر جیمز کے اشارے پر چلتے تھے۔ اس کے دروغ بے فروغ اور طمع کی رپورٹوں کو صحیفۂ آسمانی سے کم خیال نہ کر سکتے تھے۔ اور ہر ایک کو لارڈ چیمفرڈ کے طرز عمل پر تعجب ہوتا تھا کہ انہیں ڈائر اور

اوڈوائر کے کارناموں سے ہنوز درس عبرت حاصل نہیں ہوا تھا۔ میجر جیمز کے کرتوت پر چشم پوشی کر کے اس کی عزت افزائی سے ظلم رسیدہ اہل ہزارہ کے زخموں پر نمک پاشی کی گئی تھی۔ حکومت ہند ذرا چشم بصیرت کھول کر دیکھتی کہ فساد اگر در کی ذمہ داری میجر جیمز کے سر پر عائد ہوتی یا کہ خلافت کمیٹی مانسہرہ پر؟ اور باغی میجر جیمز تھے یا کہ مولانا محمد اسحٰق اور مولانا ابوالمعارف محمد عرفان صاحب و دیگر ارکان خلافت۔؟ اگر سر ہملٹن گرانٹ کی گورنمنٹ میجر جیمز کی قابلیت و خدمات کی اس قدر ثناخواں تھی تو فوراً سفارش کرنی لازم تھی۔ کہ میجر جیمز کو عراق عرب کی حکمرداری سپرد کر دی جاتی۔ یا بالشویک کے خطرے کی روک تھام کا کام انہیں تفویض کیا جاتا تاکہ جیمز جی کو ذرا چھٹی کا دودھ یاد آ جاتا۔ مظلوم و مفلوج باشندگان ہزارہ جو پہلے ہی سے ستم رسیدہ اور سرحدی قانون کی دار و گیر سے نیم بسمل تھے۔ ان پر فوج کشی کرا کے اپنی طاقت کا سکہ اور رعب جمانا چنداں قابل ستائش فعل نہ ہو سکتا تھا۔

خوش قسمتی سے خان محمد صفدر خان ای اے سی مانسہرہ و خان بہادر سعد اللہ خان پرسنل اسسٹنٹ کمشنر و خان بہادر حمید اللہ خان افسر مال ضلع ہزارہ و خان صاحب محمد حیات خان ای اے سی اگرور موجود نہ ہوتے تو یقیناً برطانوی حکومت کو بڑی بھاری مہم اور جنگی کارروائی عمل میں لانی پڑتی اور عراق عرب اور ریگی پولی کا نظارہ اگرور میں نظر آ جاتا ـــــــ بعض خود غرض اور جاہ طلب اشخاص کی بیہودہ اور جھوٹی رپورٹوں اور ڈائریوں پر میجر جیمز نے اپنی جلد بازی کی وجہ سے یقین کر کے فوراً فوجی نمائش کی۔ جس پر علاقہ غیر کے آزاد قبائل کو جوش دیا گیا۔ اور مولانا محمد اسحٰق اور مولانا ابوالمعارف محمد عرفان و دیگر ارکان خلافت کی بلاوجہ گرفتاری نے آتش غضب اور بھی بھڑکائی۔ اور اگرور میدان جنگ بنا دیا گیا۔ ان گرفتاریوں میں زیادہ تر خان بہادر محمد حسین خان کے ذاتی دشمنوں اور مخالفوں پر وبال پڑا۔ کیونکہ خان بہادر

کی مدت کی کوششوں کے بعد میجر جیمز جو ایک ناواقف شخص تھے ان کے ہاتھ لگے ورنہ مسٹر فریزر سابق ڈپٹی کمشنر کو خان بہادر کی چالیں معلوم ہو چکی تھیں۔ اگر نواب زادہ عبدالقیوم خان اور دیگر خوانین سرحدی سر ہلٹن گرانٹ کی سخت گیری اور عاقبت نا اندیشانہ طرزِ عمل پر اظہار نفرت کر کے متنبہ نہ کرتے تو یقیناً تمام سرحد پر آزاد قبائل کے ساتھ آتش جنگ کے مشتعل ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ خدا خدا کر کے بصد دشواری چند ایک ارکان خلافت کو بلا ضمانت اور بعض سے زیر دفعہ ۴۰ ضوابط سرحدی سنگین ضمانت و مچلکہ ماتحت سزاؤں کے خوف سے لیا گیا۔

پنجاب خلافت کمیٹی اور مولانا ظفر علی خاں نے سر ہلٹن گرانٹ کے جور و ظلم پر صدائے احتجاج بلند کی۔ تو میجر جیمز کو اپنا خطرہ دامن گیر ہوا۔ اور ان کی آتشِ غضب بھڑک اٹھی جھٹ مظالم ہزارہ کے نامہ نگاروں اور بیان کنندوں کی جستجو ہوئی آخر خان بہادر اور اس کے چیلے چانٹوں اور پولیس کو رہی سہی کسر نکالنے کا مزید موقع حاصل ہو گیا۔ مولوی غلام ربانی صاحب اور علی گوہر خان و سکندر خان وغیرہ کا نام پیش ہو گیا جس پر انہیں خوب ڈانٹ ڈپٹ دی گئی۔ اور حاجی مقرب خان کو جو اپنے بھائی خان بہادر کا مخالف تھا۔ گورنمنٹ کا باغی قرار دیا گیا اور فوراً اس کا لائسنس پستول ضبط کر لیا گیا۔ حالانکہ اس وقت تحصیل مانسہرہ قانون اسلحہ سے مستثنیٰ تھا۔ اور ایک معمولی سے معمولی شخص بھی اسلحہ رکھ سکتا تھا۔ لیکن میجر جیمز کی عقل کے صدقے جائیے۔ کہ ایک رئیس جس کو اپنی جان کا ہر وقت خطرہ رہتا تھا۔ حفاظت خود اختیاری سے محروم کر دیا۔

۵

پس از سی سال ایں معنی محقق شد بخاقانی
کہ خدمت ہائے نصرانی بود آخر پشیمانی

چونکہ میجر جیمز پر بیکاری کا بھوت ہر وقت سوار رہتا تھا۔ اور ان کو ہر روز

نئے نئے مشغلہ کی تلاش رہتی تھی۔ اس لئے آئے دن کوئی نہ کوئی بات ان کے ہاتھ آجاتی تھی۔ خلافت کمیٹی مانسہرہ نے میجر جیمز کی نظر بد کو تاڑ کر تین ہزار روپیہ کی رقم بذریعہ تار مرکزی خلافت کمیٹی (ہندوستان) کو بھیجی۔ اس پر میجر جیمز کے غصہ و جوش کا پارہ چڑھ گیا۔ جھٹ پٹ ارکان خلافت کی گرفتاری عمل میں لائی گئی۔ جس پر خلافت کمیٹی نے چیف کمشنر کو سب معاملہ کی اطلاع دی۔ خدا خدا کر کے سر ہملٹن گرانٹ بیدار ہوئے اور غالباً میجر جیمز کو آئندہ کارروائی سے منع کر دیا گیا۔

لیکن پھر میجر جیمز نے نہایت ہوشیاری سے فضل الرحمٰن خان ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کی وساطت سے دباؤ ڈال کر علی گوہر خان وائس پریذیڈنٹ و سکندر خان نائب ناظم و باوا اسکراج خزانچی و حاکم خان وغیرہ سے جبراً و قہراً حاصل کرالی اور غالباً چیف کمشنر کو اپنی کارگذاری سے مطلع کیا کہ یہ حضرات تحریک خلافت کو دوبارہ زندہ کرتے تھے۔ سر ہملٹن گرانٹ کا دماغ دفتری حکومت کا دالہ و شیدا تھا۔ اس لئے انہوں نے دفتر میں ایک ورق سیاسی کے اضافہ کو غنیمت سمجھ کر میجر جیمز کے غیر آئینی طرز عمل پر کوئی باز پرس نہ کی۔ پھر خان بہادر اور اس کے حواریوں اور پولیس نے ایک اور خطرے کا ثبوت میجر جیمز کو دکھایا۔ میجر موصوف کو ہر وقت سب لوگ مہاتما گاندھی کے لشکر دکھائی دیتے تھے۔ اس لئے میجر جیمز کو ہر بات پر زیادہ شبہ پڑ جاتا تھا۔ انہیں خان بہادر کے گروہ نے یقین دلایا کہ آپ کے خودمختارانہ اور غیر آئینی طرز عمل کو اگر جانچنے والا کوئی ہے تو غلام ربانی خان بی اے وکیل مانسہرہ ہیں۔ کہ یہی خلافت کے اصلی روح رواں اور تعلیم یافتہ عنصر میں جوش عمل پھیلانے والے ہیں۔ اگر انہیں مانسہرہ سے تبدیل کرا دیا جائے۔ تو پھر خلافت کا زندہ کرنا دشوار بلکہ ناممکن ہے۔ اور آپ پھر مزے سے عیش پرستی اور چیرہ دستی کرلیں کوئی شخص آپ کے آرام میں خلل انداز نہیں ہو سکتا۔ میجر جیمز نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ جھٹ پشاور پہنچ کر "مسٹر دینی" جو ڈھیل

کمشنر کے مہمان ہو کر میزبان سے غلام ربانی خان کی تبدیلی کا وعدہ لیا۔ وہاں کیا دیر تھی۔ فوراً حکم نامہ جاری ہو گیا۔ کہ تمہاری ملازمت مانسہرہ میں بہت زیادہ گزر چکی ہے (یعنی کوئی دو تین سال) تمہیں مردان تبدیل کیا جاتا ہے۔ بظاہر یہ کارروائی پبلک کے آرام کی خاطر اور بباطن میجر جیمز کی کارستانی اور خوشی کی خاطر عمل میں آئی۔

میجر جیمز مدت سے غلام ربانی خان وکیل کی نسبت بھی خواب پریشاں نظر آتے تھے۔ مؤخر الذکر میجر جیمز کی بدسلوکی اور ناشائستہ برتاؤ کے باعث ہمیشہ سیاسی معاملات سے الگ تھلگ رہے۔ اور نہایت پرامن اور بے تعلق طریقہ سے زندگی بسر کرتے رہے۔ حالانکہ قانون دان کی حیثیت سے معروف اور غیر معروف افراد سے شناسائی ہونے کے باوجود قومی معاملات سے اپنا پہلو بچاتے رہے لیکن میجر جیمز کے صدقے جائیے۔ کہ وہ خدام خلافت کی صفوں میں نت نئے لائق تعلیم یافتہ افراد کا جبراً اضافہ کر دیتے تھے۔ درحقیقت جس تقریر کی یاداشت میں غلام ربانی خان کی تبدیلی مانسہرہ سے مردان کے احکامات صادر کئے گئے تھے وہ غلام ربانی دلازاک نے کی تھی۔

عبدالقیوم خان بی اے جو ایک نہایت معزز خاندان کے فرد تھے ان کو میجر جیمز نے سرکاری ملازمت میں لینے سے اس لئے انکار کیا کہ ان کے بڑے بھائی غلام رسول خان رئیس سفیدہ خلافت میں حصہ لے رہے تھے۔ غلام ربانی خان وکیل کو تحریک خلافت میں حصہ لینے پر صرف شبہ اور شک پر ایک دفعہ پیشتر یعنی جولائی ۱۹۲۰ء میں بھی تبدیل کیا گیا تھا۔ لیکن میجر جیمز کو اپنی بے ضابطگی و غیر آئینی کارروائی پر خود نادم ہونا پڑا تھا۔ مگر غلام ربانی خان اور ان کے رشتہ داروں کے فرضی گناہ میں ان کے سن رسیدہ والد بزرگوار

محمد مطیع اللہ خان کو ٹانک سے ہری پور بھیج دیا گیا۔ اور ان کی جگہ خاص سفارش پر خان بہادر کے پسر محمد فیروز خان قائمقام تحصیلدار متعین کر کے محمد مطیع اللہ خان کو ڈیرہ اسمٰعیل خان متعین کر دیا گیا اور وہاں ہفتہ عشرہ کے قیام کے بعد پھر ٹانک کی نہایت خطرناک اور ردی تحصیل میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ جس کو اس وقت صوبہ سرحدی میں "انڈمان" کا رتبہ حاصل تھا اور جہاں امیر چند ممول کو نظربند رکھا گیا تھا۔ حالانکہ مطیع اللہ خان جنگ وزیرستان میں جو نہایت جان جوکھوں کا کام تھا دو تین سال پیشتر نہایت خوش اسلوبی سے خدمات بجا لا چکے تھے۔ اور اس قدر جلد ان کی تبدیلی اصولاً ناجائز اور محض بطور سزا تھی۔ لیکن صوبہ سرحدی کی حکومت ہی جیمز شاہی تھی۔ اور میجر صاحب کو ہر معاملہ اور صوبہ کے ہر ایک حصہ میں مداخلت بے جا کے اختیارات حاصل تھے۔ عموماً سب حکام اور افسر میجر صاحب کے ارشاد کی تعمیل میں قانون اور انصاف کو بالائے طاق رکھ کر یہ کہتے ہوئے فوراً سرنگوں ہو جاتے تھے ؏

"ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند"

پولیس مانسہرہ کے حالات اور معاملات ڈاکہ

ماہ اکتوبر ۱۹۲۰ء میں بمقام مانسہرہ ایک منڈی پر ڈاکہ پڑا۔ دو ہندوؤں نے عبدالرحمٰن کانسٹیبل کو پہچان کر کشمکش کی۔ ڈاکو مع عبدالرحمٰن بھاگ گئے۔ مالکان منڈی نے سپرنٹنڈنٹ پولیس کو رپورٹ دی۔ کہ عبدالرحمٰن کانسٹیبل نے شریک ہو کر یہ ڈاکہ ڈالا ہے۔ اور ڈاکوؤں میں ہم نے اسے پہچانا ہے۔ لیکن یہ کہہ کر اس وقوعہ کو سپرنٹنڈنٹ پولیس نے عدم پتہ کرا دیا۔ کہ ہندو اور مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ اور عبدالرحمٰن خلافت کے معاملہ میں مخبری کرتا تھا

اب ہندو مسلمان متفق ہو کر اس کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

اس کے بعد ضلع میں متعدد چوری نقب زنی وغیرہ کے واقعات پیش آئے۔ جن میں پولیس کی آمیزش کی بو آتی تھی۔ مانسہرہ میں شب مابین ۱۴/۱۵ فروری ۱۹۲۱ء ایک بڑا ڈاکہ پڑا۔ بارہ بجے سے لے کر ڈھائی بجے صبح تک پورے ڈھائی گھنٹے گولی چلتی رہی۔ پولیس کے سپاہی موقعۂ واردات سے سو قدم کے فاصلے پر بیٹھے رہے۔ لیکن ڈاکوؤں کی بالکل مزاحمت نہیں کی گئی ڈاکو مال وغیرہ لے کر چلے گئے تب پولیس موقع پر آکر ہاؤ ہو کرنے لگی تعجب تو یہ تھا کہ پورے ڈھائی گھنٹے پولیس سامنے آرام سے بیٹھی رہی چند ڈاکو بازار کے لوگوں سے بات چیت بھی کرتے تھے اور ہوائی فائر بھی کرتے تھے۔ صبح کو مارٹن ہنری بندوق کے خالی کارتوس بھی موقعۂ واردات کے قریب پائے گئے۔ یہی بندوق ہزارہ میں پولیس کے پاس تھی۔

محمود شاہ ساکن ڈوگہ مانسہرہ کے قرب وجوار میں ایک شخص تھا جس نے کئی ڈاکے ڈالے تھے اور کئی قتل بھی کئے تھے۔ جسے پولیس نے گرفتار نہیں کیا تھا حالانکہ وہ گھر میں رہتا تھا۔ میجر جیمز فرمایا کرتے تھے کہ

"لوگ لڑیں مریں تاکہ خلافت کے لئے وہ فارغ نہ رہیں"

میجر جیمز کی اس حکمت عملی اور پولیس کی کارروائی پر لوگ حیران تھے اور سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کہ حکومت برطانیہ کے عہدہ دار کیا کر رہے تھے۔

ریاست تناول کی حالت

تمام علاقہ تناول میں شخصی حکومت تھی۔ ریاست کی اراضی نواب تناول کی واحد ملکیت تھی۔ ریاست کے اٹھائیس تیس ہزار نفوس نواب صاحب کے

غلام بے دام تھے۔ اور نواب صاحب خدا کی آزاد مخلوق پر اس طرح حکومت کرتے تھے۔ گویا وہ انہی کے پیدا کردہ تھے۔ حریت کی صدائیں تمام کرۂ ارض میں چکر لگا رہی تھیں۔ جس سے نواب صاحب بے خبر نہیں تھے۔ وہ یہ جانتے تھے۔ کہ حکومتِ برطانیہ کے دم قدم سے آن بان سے مسلمانوں پر شخصی حکومت کا جال ڈال کر مزے اڑا رہا ہوں۔ اس لئے وہ حکومت کے پورے خیرخواہ تھے۔

تحریک خلافت کو انہوں نے ریاست میں بالکل روک رکھا تھا۔ جو لوگ مجالس خلافت میں آکر شریک ہوئے۔ ان کو انہوں نے سزائے قید دی۔ شورش اگردر میں انہوں نے پوری امداد دی۔ علاقہ غیر کے قبائل کو انہوں نے شورش کرنے سے روکا۔ بندوق سرکاری واپس کردیں۔

ان حالات کو ایک طرف رکھتے ہوئے جب دوسری جانب خیال آتا ہے تو سخت حیرانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ بعض مواجب خوار خوانین علاقہ غیر سے اس امر پر جبریہ ثبت کروائی گئیں۔ کہ شورش اگردر نواب کے ایماء سے وقوع میں آئی۔

مانسہرہ میں ۲۷ اگست ۱۹۲۰ء کو جلسہ خلافت ہوا۔ تو مشتہر کیا گیا کہ ریاست کے لوگ اسلحہ سے مسلح ہیں۔ شہر پر ڈاکہ ڈالنے والے ہیں۔ چنانچہ رات کو فرضی ڈاکہ ڈالا گیا یہاں پر ایک نہایت ہی عجیب خبر یہ سننے میں آئی۔ کہ میجر جیمز نے سحری کے وقت ایک گورکھا بناوٹی مجروح کو شیر باز اسسٹنٹ سرجن مانسہرہ کے پاس پہنچا کر کہا۔ خانصاحب! اس کی گولی نکالو۔ خانصاحب نے ملاحظہ کرنے پر معلوم کر لیا کہ گولی وغیرہ تو سپاہی کو لگی ہی نہیں۔ صرف بناوٹی کارروائی ہے۔ میجر صاحب کے روبرو کچھ ادھر ادھر کا عذر پیش کرکے رد ئی لپیٹ کر میجر صاحب کو ٹال دیا۔

مانسہرہ میں چودہ پندرہ فروری ۱۹۲۱ء کو جو ڈاکہ پڑا۔ اس کی نسبت

بھی افواہ پھیلائی گئی۔ کہ ریاست کے آدمیوں نے ڈاکہ ڈالا تھا۔ حکومت کے پٹھو اور میجر جیمز کے حواری اور زائرین ہمیشہ ہر بات کا بوجھ ریاست پر ڈالتے تھے ادھر اسمٰعیل خان برادر نواب صاحب کو ایک سنہری سند عطا کی تھی۔ نواب زادہ محمد فرید خان ولی عہد ریاست کے طرز عمل سے کچھ اور ہی عیاں ہوتا تھا۔ پولیٹیکل ای اے سی اوگی کی آمد و رفت سے ریاست اور ولیعہد کے مشورے اور ساز باز غرضیکہ اس تمام حکمت عملی سے اس وقت یہ پتہ نہ چل سکا کہ ریاست کے مستقبل پر اس کا کیا اثر ہوگا۔ اور اس اثر سے ریاست اور سرحدی قبائل کے اندر جو نتائج پیدا ہونگے وہ مفید ہونگے یا مضر؟ شاید میجر جیمز جو اس حکمت عملی کے بانی مبانی تھے۔ ان نتائج کو اپنی گورنمنٹ کیلئے مفید خیال کرتے تھے۔ لیکن جمہور کو یہ فکر دامنگیر تھی کہ ضلع ہزارہ میدان جنگ بن کر کہیں ہم پر کوئی آفت نہ لائے۔
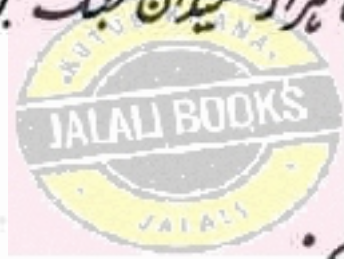
ترک موالات اور میجر جیمز

اپنے ضلع میں میجر جیمز نے نہایت جبر اور تشدد سے کام لے کر عدم تعاون کی لہر کو توڑا۔ جملہ ترک موالات کرنے والوں کو پولیس کے ذریعے ڈرا دھمکا کر تعاون پر مجبور کر لیا تھا۔ صرف مولوی غلام ربانی اور قاضی محمد اعظم ہی دو وجود پابند ترک موالات ضلع میں اس وقت سلامت موجود تھے۔ مولوی غلام ربانی کو تو بات بات پر جیل پہنچایا جاتا تھا لیکن قاضی محمد اعظم کے ساتھ جو سلوک روا رکھا اس کی اجمالی کیفیت یہ تھی کہ قاضی صاحب نے ترکی کی شرائط صلح کو تمام اسلامی احساس کے خلاف معلوم کر کے پہلے باقاعدہ نوٹس دیا۔ اور پھر ماہ جون میں استعفیٰ باقاعدہ دیا۔ قاضی صاحب کے استعفیٰ کا چرچا تمام فوجی اور سویلین

افسروں میں پھیل گیا۔ جولائی کے وسط میں ان کے بنگلہ کو آگ لگ گئی۔ آگ کے فرو کرنے میں پانی تک نہیں دیا گیا۔ پہلے تو پانی کے تالاب کی چابی نہ ملتی تھی۔ جب آگ پوری طرح مشتعل ہو گئی اور دروازے کھڑکیاں جلنی باقی تھیں۔ اس وقت چابی ملی۔ جرنیل صاحب نے حکم دیا کہ پانی کو ضائع نہ کرو کہ سب کا سب بنگلہ جل گیا ہے۔ دس اگست کو قاضی صاحب نوکری سے سبکدوش ہوئے۔ انتیس اگست کو انہیں گرفتار کیا گیا۔ اور چھ ستمبر تک اگردر وغیرہ مقامات میں لوگوں کو سمجھانے کی خاطر ان کو پھرایا گیا۔ تاکہ مزید فساد نہ ہو۔ اکتوبر کے اخیر قاضی صاحب نے نقشہ جات میونسپل کمیٹی کو برائے منظوری تعمیرات اور جلے ہوئے بنگلہ پر چھت ڈالنے کے لئے دیئے۔ اور عرض کی کہ موسم برسات آرہا ہے۔ میرے متعدد بڑھئی بیکار ہیں۔ لہذا فوری منظوری عطا کی جائے۔ لیکن یہ فوری منظوری چار عرضیوں کے باوجود چھ ستمبر کو ملی۔ حالانکہ خاص منظوری ایک آدھ دن میں کئی آدمیوں کو مل چکی تھی۔ معمولی منظوری کیلئے تین اجلاسوں کے بعد بیس ستمبر کو کاغذات پیش کئے گئے۔ چونکہ خاص شرارت پیش نظر تھی۔ اس لئے نیم منظوری نہایت مہمل اور نقشہ کے صریح خلاف دی گئی۔

چھ ہفتہ کے بعد اگر درخواست کنندہ کو منظوری نہ دی جائے تو بڑے قواعد میونسپل درخواست کنندہ مجاز تھا کہ کام تعمیر شروع کر دے۔ لیکن قاضی صاحب نے تین ماہ کے بعد کام شروع کیا تھا

قاضی صاحب اور دوسرے آدمیوں کے بھی ایسے ہی فعل تھے کہ انہوں نے بغیر منظوری حاصل کئے کام شروع کر دیا تھا۔ یہ تین مقدمے کمیٹی کے اجلاس میں پیش ہوئے۔ قاضی صاحب پر میجر جیمز پریذیڈنٹ کمیٹی نے تین سو روپیہ ہرجانہ تجویز کیا۔ یا عمارت کو گرایا جاتا۔ اور دوسرے دو آدمیوں کو معاف

کردیا۔ حالانکہ انہوں نے نہ کوئی درخواست دی تھی نہ نقشہ، اور تعمیر مکمل کر لی تھی۔

قاضی صاحب کی عمارت کا اثر نہ تو پڑوسیوں پر پڑتا تھا اور نہ حفظان صحت کو کوئی نقصان تھا۔ نہ کسی کی اس عمارت پر شکایت تھی اور دوسری جانب ایک وکیل جنہوں نے تمام محلہ کو بلند بارہ دری بنا کر بے پردہ کر دیا تھا۔ اور بلا اجازت بارہ دری بنائی صرف پانچ روپیہ ہرجانہ کا مستوجب قرار دیا گیا۔

اسی طرح قاضی صاحب نے ابھی بہت سے مکانات اور بھی بنانے تھے۔ خدا جانے ان کو کس کس مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا یہ سب کیوں؟ اس لئے کہ قاضی صاحب نے آئینی طریقہ پر ایک اعلیٰ عہدہ سے عدم تعاون کے اصول پر علیحدگی اختیار کی تھی اس وقت صورت حال یہ تھی۔ کہ کوئی نمبردار یا ملازم اگر ضلع ہزارہ میں استعفےٰ کا نام لے لیتا تو جیل خانہ میں پہنچ جاتا تھا۔ اور ہمیشہ کے لئے میجر جیمز اس کا دشمن ہو جاتا تھا۔

مولوی غلام نبی صاحب انہی ایام میں مولینا شیخ الہندؒ صاحب مرحوم کی زیارت کو گئے تھے۔ ان کو جیل بھیج دیا گیا۔ اور خوب ڈرا دھمکا کر چھوڑا۔ مولوی غلام ربانی کو زبانی حکم دیا گیا کہ تم ضلع سے باہر نہ جاؤ۔ خلافت کا کام تو درکنار اس وقت تلاش معاش اور سیر و سیاحت سے بھی ان کو روک دیا تھا المختصر باہر سے کوئی لیڈر یا پیشوائے قوم ہزارہ میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ ؎

زباں بندی، فغاں بندی، مکاں بندی، نظر بندی

یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

ان دنوں "اصلاحات جدیدہ" کی وساطت سے جو "عظیم الشان" برکات وحسنات ہندوستانیوں پر نازل ہوئیں ان میں سے ایک برکت یہ بھی تھی۔ ایک ہندوستانی جو ملک میں بہت بڑا متقن سمجھا جاتا تھا۔ اور جو پہلا ہندوستانی

ایڈوکیٹ جنرل، انتظامی کونسل کا پہلا ہندوستانی رکن، وزیر ہند کا پہلا ہندوستانی انڈر سیکرٹری، اور پہلا ہندوستانی لارڈ تھا ایک صوبہ کی گورنری کے عہدہ جلیلہ پر فائز و ممتاز کیا گیا۔

بعض بیدار مغز افراد نے حکومت کی شاندار فیاضی پر پہلے ہی لکھ دیا تھا۔ کہ لارڈ سنہا انگریز گورنروں سے بھی بدتر ثابت ہوں گے۔ چنانچہ واقعات نے ثابت کر دیا اور ان کا اندازہ بالکل درست نکلا۔ بنگال کے گورنر مانلڈ شے نے اپنی قانونی کونسل کی صدارت مسٹر سید شمس الہدیٰ کو عطا فرمائی۔ لیکن "ہمارے" گورنر نے یہی عہدہ اپنے صوبے میں ایک انگریز کے سپرد کیا۔ صوبے میں شراب اور دیگر منشیات کے خلاف تحریک شروع ہوئی تو گورنر صاحب نے اندیشہ ظاہر کیا کہ اگر لوگ یکدم پرہیزگار بن گئے تو حکومت کو محکمہ آبکاری سے جو آمدنی ہوتی ہے اس میں فرق پڑ جائے گا۔ لہذا عوام کو چاہیئے کہ وہ آہستہ آہستہ پرہیزگار بننے کی کوشش کریں۔ یک لخت شراب نہ چھوڑیں۔

عدم تعاون کی تحریک کا مقابلہ ہر صوبے کے حکام جبر و تشدد سے کر رہے تھے لیکن انگریز گورنروں کے صوبوں میں اتنا تشدد نہیں تھا جتنا کہ بہار اڑیسہ میں ہو رہا تھا۔ انہی دنوں لارڈ سنہا نے جو گشتی حکم نامہ اپنے ماتحت افسروں کے نام روانہ کیا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ لارڈ مذکور جبر و استبداد کی حکمت عملی میں تمام ہندوستان بھر کی مقامی حکومتوں سے گوئے سبقت لے جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے ماتحت افسروں کو اجازت دے دی تھی کہ عدم تعاون کی تحریک کو دبانے کیلئے پورے اختیارات استعمال کریں۔ اور آگے چل کر یہاں تک اجازت دی تھی کہ تمام انتظامی حکام اور ان کے سب ڈویژنل افسر آئندہ دو ماہ کے دوران میں اپنے علاقہ کا خوب دورہ کریں۔ اس کی کچھ پرواہ نہیں کہ

دوسرے کاموں میں تعویق و تاخیر ہو جائے۔ اور عدم تعاون کی تحریک کے انسداد کو سب سے ضروری کاموں پر رکھا تھا۔ ؎

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار
بگزارند و خم طرۂ یارے گیرند

پھر انہوں نے فرمایا تھا کہ

"جہاں عدم تعاون کی تحریک سے کوئی شورش یا بدنظمی ہوئی۔ وہاں کے مقامی لیڈر اس کے ذمہ دار قرار دیئے جائیں گے۔ یعنی عوام یا بعض شریر لوگ غصہ میں آکر کسی کو مار بیٹھیں یا کوئی اشتداد آمیز حرکت ان سے سرزد ہو جائے تو ان سے باز پرس نہ ہو گی، بلکہ ان رہنمایان تحریک پر بلائے تعزیر نازل کی جائے گی"

جو ہمیشہ امن و امان قائم کرنے کی ہدایت کرتے رہتے تھے۔ "اللہ اکبر! ناز کوئی کرتا اور "خون دو عالم" لیڈروں کی گردن پر سوار ہوتا تھا۔

اس کے علاوہ انہوں نے یہ دھمکی بھی دی تھی۔ کہ

"عنقریب عدم تعاون کی تحریک کے خلاف نہایت سرگرمی سے عملی تدابیر اختیار کی جائینگی"

لیکن سب حیران تھے کہ اس سے زیادہ عملی تدابیر کیا ہو سکتی تھیں۔ انہوں نے ماتحت انتظامی افسروں کی خود مختاری اور مطلق العنانی کا پٹہ تو لکھ دیا تھا۔ اور انہیں رعایا کی جان و مال پر چنگیز خانی اختیار تو دے دیا تھا۔ وہ اس سے زیادہ کونسی پر زور عملی تدابیر اختیار کر سکتے تھے۔ کیا لارڈ موصوف کا ارادہ مارشل لا جاری کرنے کا نہیں تھا؟ کیا جرنیل ڈائر نے امرتسر میں کوئی کسر رہنے دی تھی جسے وہ پورا کرنے کا ارادہ کرتے تھے؟

دوسرے کاموں میں تعویق و تاخیر ہو جائے۔ اور عدم تعاون کی تحریک کے انسداد کو سب سے ضروری کاموں پر رکھا تھا۔ ؎

مصلحت دیدمن آنست کہ یاراں ہمہ کار
بگزرانند و خم طرۂ یارے گیرند

پھر انہوں نے فرمایا تھا کہ

" جہاں عدم تعاون کی تحریک سے کوئی شورش یا بدنظمی ہوئی۔ وہاں کے مقامی لیڈر اس کے ذمہ دار قرار دیئے جائیں گے۔ یعنی عوام یا بعض شریر لوگ غصہ میں آکر کسی کو مار بیٹھیں یا کوئی استبداد آمیز حرکت ان سے سرزد ہو جائے تو ان سے باز پرس نہ ہو گی، بلکہ ان رہنمایان تحریک پر بلائے تعزیر نازل کی جائے گی"

جو ہمیشہ امن و امان قائم کرنے کی ہدایت کرتے رہتے تھے۔ اللہ اکبر! "شق ناز" کوئی کرتا اور "خون دو عالم" لیڈروں کی گردن پر سوار ہوتا تھا۔

اس کے علاوہ انہوں نے یہ دھمکی بھی دی تھی۔ کہ

" عنقریب عدم تعاون کی تحریک کے خلاف نہایت سرگرمی سے عملی تدابیر اختیار کی جائینگی"

لیکن سب حیران تھے کہ اس سے زیادہ عملی تدابیر کیا ہو سکتی تھیں۔ انہوں نے ماتحت انتظامی افسروں کی خود مختاری اور مطلق العنانی کا پٹہ تو لکھ دیا تھا۔ اور انہیں رعایا کی جان و مال پر چنگیز خانی اختیار تو دے دیا تھا۔ وہ اس سے زیادہ کونسی پرزور عملی تدابیر اختیار کر سکتے تھے۔ کیا لارڈ موصوف کا ارادہ مارشل لا جاری کرنے کا نہیں تھا؟ کیا جرنیل ڈائر نے امرتسر میں کوئی کسر رہنے دی تھی جسے وہ پورا کرنے کا ارادہ کرتے تھے؟

حکومت برطانیہ کی چالوں سے بھی خدا بچائے، جبر و تشدد کے جوش و خروش اور استبداد کی طوفان خیزی کے لئے سب سے پہلے بہار اور اڑیسہ کے گورنر کو آمادہ کیا تھا، تاکہ جب انگلستان کی پارلیمنٹ میں کوئی آزاد خیال ممبر اس جبر و تشدد کے خلاف آواز بلند کرے، تو وزیر ہند اور ان کے خواجہ تاشوں کو یہ جواب دینے کا موقعہ مل جائے کہ ہندوستان کی صورت حالات بہت خراب ہو چکی تھی۔ اور اس کا بڑا ثبوت یہ تھا، کہ ایک ہندوستانی گورنر نے تشدد کے سوا اور کوئی طریق کار نہیں دیکھا تھا۔ اور جابرانہ حکمتِ عملی میں سبقت و اولیت اختیار کی تھی۔

اس کے علاوہ حکومت برطانیہ کے ارباب حل وعقد یہ کہتے تھے کہ اہل ہند وائسراؤں اور انگریز گورنروں پر یہ الزام دھرا کرتے تھے کہ وہ رائی کا پہاڑ بنا کر ہندوستان کی صورت حالات سے خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔ اور اندھا دھند جبر و تشدد کا آغاز کر دیتے ہیں۔ لیکن اب تو ایک ہندوستانی گورنر نے بھی وہی تدابیر اختیار کر رکھی ہیں۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان میں تحریک عدم تعاون نہایت خطرناک صورت اختیار کر رہی ہے اور ملک کا امن و امان بالعموم خطرے میں پڑ رہا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ایک ہندوستانی گورنر کو جبر و تشدد پر کاربند ہونے کی کیا ضرورت تھی؟

اس قسم کے دلائل و براہین سے کہ پارلیمنٹ میں سخت غلط فہمی پھیلی تھی کیونکہ انگلستان کے لوگ ہندوستانی گورنر کے دماغ کی ساخت کو سمجھنے سے عاری تھے۔ وہ دماغ تو غلامی و محکومی میں اس قدر لت پت تھا کہ اس کے جذبات، اس کے خیالات، اس کے احساسات ہندوستانی نہیں تھے بلکہ بالکل انگریزی ہو چکے تھے۔ پھر وہ ہندوستانیوں کی طرح کسی معاملہ پر

غور و خوض نہیں کر سکتا تھا۔ بلکہ انگریزوں کی طرح سوچتا تھا۔ انگریزوں کی طرح محسوس ہوتا تھا۔ اور انگریزوں کی طرح نتائج مرتب کرتا تھا۔

جس دن سے اصلاحات معرض وجود میں آئی تھیں پھر ان کی "برکات و حسنات" کا سلسلہ جبر و تشدد ہی نظر آتا تھا۔ اور اس میں یعقوب حسن اور ان کے رفقاء گرفتار کئے گئے۔ پنجاب میں قانون امتناع مجالس باغیانہ نافذ ہوا تھا۔ رہنمایان قوم کی زبانیں بند کی گئیں۔ صوبجات متحدہ میں متعدد اصحاب گرفتار کئے گئے تھے۔ پشاور میں امیر چند بموال اور عبدالجلیل ندوی تین تین سال جیل بھیج دیئے گئے تھے۔ اور اسی طرح ضلع ہزارہ میں عبدالقیوم خان صواتی رئیس سفیدہ تحصیل مانسہرہ اور ملک میر عالم خان اعوان سکونتی ڈب داخلی مانسہرہ گرفتار کئے گئے تھے۔ غرض ایک برکت ہوتی تو کہی جاتی۔ یہاں تو ایک سلسلۂ برکات تھا۔ کہ ختم ہونے میں ہی نہیں آتا تھا۔ اعتدال پسند حضرات بغلیں بجا رہے تھے۔ کہ "دور جدید" کی کونسلیں خوب بحث مباحثہ کر رہی تھیں۔ اور حکومت کو چھٹی کا دودھ یاد آ رہا تھا۔ لیکن وہ یہ نہیں دیکھتے تھے۔ کہ جبر و استبداد کی حکمت عملی اختیار کر کے اپنے لئے ایک نہایت گہرا گڑھا کھود رہی تھی۔ اعتدال پسند حضرات سیاسیات ملکی سے واقف و باخبر ہونے کا ادعا رکھتے تھے کیا وہ نہایت نیک نیتی اور دیانت کے ساتھ یہ بتلاتے تھے کہ کیا جبر و استبداد سے تحریکات قومی کا مردہ کر دینا ممکن تھا؟ کیا اس جبر کا نتیجہ مزید اشتعال نہ تھا؟ کیا یہ جبر و ظلم کا سلسلہ حکومت کے حق میں مفید ہو سکتا تھا؟ افسوس! اعتدال پسند حضرات حکومت کے بہت بڑے خیر خواہ اور انگریزوں کے بہت مخلص دوست ہونے کے باوجود انہیں نیکی کی ہدایت نہیں دیتے تھے؟

ضلع ہزارہ میں میجر جیمز نے خدام خلافت کو اذیتیں دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا تھا۔ کسی کو پابند سلاسل کیا۔ کسی کو پابند مسکن کیا۔ کسی کو جلاوطن کیا۔ الغرض تحریک خلافت کو ختم کرنے کیلئے ہر حربہ استعمال کیا گیا تھا۔ اس کے باوجود غیور اور غیرت مند افراد کے سینوں میں ایمان کی چنگاریاں مسلسل سلگتی رہیں۔ "مملکت جیمز شاہی" کی حدود سے باہر ہندوستان کے دیگر اضلاع میں تحریک خلافت روز بروز زور پکڑ رہی تھی۔ میجر جیمز کی آمرانہ کمرانی اور ظلم و استبداد کے باعث ہندوستان کے کونے کونے میں یہ واقعات پہنچے۔ اس کا ردعمل یہ ہوا کہ ہندوستان کے دیگر اضلاع میں لوگوں نے تحریک خلافت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اس سے پیشتر "آل انڈیا خلافت کانفرنس" ۸۔ ۹۔ ۱۰ ر جولائی ۱۹۲۱ء کو کراچی میں منعقد ہوئی۔ صدارت کے فرائض حضرت مولانا محمد علی جوہر نے سرانجام دیئے۔ جس میں حسب ذیل ریزولیوشن بتائید تحریک و تائید کر کے پاس کیا تھا۔

"آل انڈیا خلافت کانفرنس کا یہ جلسہ غازی مصطفےٰ کمال پاشا اور حکومت انگورہ کو تہہ دل سے ان کی شاندار فتوحات اور بقائے حکومت اسلامیہ کیلئے سرفروشانہ کوششوں کی کامیابی پر مبارک باد دیتا ہے اور رب العزت کی بارگاہ میں دعا کرتا ہے۔ کہ جلد سے جلد غیر حکومتوں کی تمام افواج کو سلطنت ترکی کے ہر گوشہ سے خارج کر دینے میں کامیاب ہوں (آمین) اس کے ساتھ یہ جلسہ اس امر کا صاف اعلان کرتا ہے۔ کہ ہر مسلمان پر انگریزی فوج میں اس وقت نوکر رہنا بھرتی ہونا یا اس میں دوسروں کو بھرتی کرانا شرعاً قطعی حرام ہے۔ اور مسلمانوں کا بالعموم اور علماء کا بالخصوص یہ فرض ہے کہ اس باب میں شریعت کے احکام فوج کے مسلمانوں تک پہنچا دیں۔ علاوہ ازیں یہ جلسہ اس امر کا بھی اعلان کرتا ہے۔ کہ انگریزی

حکومت، حکومتِ انگورہ کے خلاف بالواسطہ یا بلاواسطہ علانیہ یا خفیہ طور پر جنگی کارروائی کرے گی تو مسلمانانِ ہندوستان مجبور ہونگے کہ کانگرس کو اپنی معیت میں لے کر قانون شکنی شروع کر دیں اور آئندہ کانگرس کے سالانہ جلسہ میں جو احمد آباد میں منعقد ہونا قرار پایا ہے ہندوستان کی کامل آزادی اور ہندوستان میں جمہوری حکومت کا اعلان کر دیں"

پونہ۔ ۱۳ راگست ۱۹۲۱ء

اس ریزولیوشن کے پاس ہونے کے بعد بموجب حکم گورنمنٹ بمبئی مورخہ ۱۳ راگست ۱۹۲۱ء جس کی رو سے ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کراچی نے حضرت مولانا محمد علی جوہر (رامپوری) مولانا حسین احمد صاحب دیوبندی مہاجر مدنی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو امرتسری، پیر غلام مجدد صاحب سندھی، مولانا نثار احمد صاحب کانپوری، جگت گروشنکر اچاریا جی شاردا پیٹھ (بھارتی کرشنا تیرتھ جی عرف دنکٹ رام) اور مولانا شوکت علی کے خلاف زیر دفعہ ۵۰۵ تعزیرات ہند استغاثہ دائر کرنے کا اختیار دیا گیا۔ زمان شاہ ولد محبوب شاہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کراچی نے ۲۰ ستمبر ۱۹۲۱ء بعدالت ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کراچی استغاثہ دائر کیا۔ کہ وہ سپاہیوں کو فرائض کی انجام دہی اور وفاداری سے ہٹانے کی کوشش میں ایک مجرمانہ سازش میں شریک اور مشغول تھے کہ ملزمان سے بموجب قانون بازپرس کی جائے۔ بظاہر کہنے کیلئے ایک مقدمہ تھا۔ مگر حقیقت میں وہ حق و باطل کی ایک جنگ تھی۔ جس میں ایک فریق کو شکست اور دوسرے کو فتح ہوئی۔ اور گورنمنٹ نے علی برادران اور ان کے رفقاء پر مقدمہ دائر کرنے سے جو فائدہ سمجھ رکھا تھا۔ وہ خود بہتر جانتی تھی۔ مگر ساکنانِ ہند بھی یہ سمجھ رہے تھے کہ

(۱) گورنمنٹ کا مقصد اس مقدمہ سے یہ تھا کہ فوج اور پولیس کے

کانوں تک مذہب کی دعوت نہ پہنچ سکے

(۲) خلافت اور سوراج کی تحریک کو اس کے اچھے اور ممتاز خدمت گذاروں کو جدا کر کے نقصان پہنچایا جائے۔ اور

(۳) یہ بھی اندازہ کیا جائے کہ ملک پر ان گرفتاریوں اور سزاؤں کا کیا اثر ہوتا ہے۔

چنانچہ اس کے باوجود مولانا شوکت علی صاحب کے خلاف دوسرا مقدمہ جس میں بغاوت کا الزام تھا۔ آر آر بوائر ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس (کراچی) نے استغاثہ زیر دفعہ ۱۲۴ (الف) و ۱۵۳ (الف) تعزیرات ہند بعدالت مجسٹریٹ درجہ اول کراچی مورخہ ۲۳ ستمبر ۱۹۲۱ء کو دائر کیا کہ ملزم نے بتاریخ ۱۰ جولائی ۱۹۲۱ء خلافت کانفرنس کراچی کے جلسہ میں انگریزوں اور ملک معظم کی ہندوستانی رعایا کے دیگر طبقات کے درمیان نفرت اور دشمنی پھیلانے کا اقدام کیا۔ اور اسی روز کو مولانا محمد علی جوہر کیخلاف دوسرا بغاوت کا مقدمہ زیر دفعہ ۱۲۴ (الف) تعزیرات ہند دائر کیا۔ کہ ملزم نے بمقام کراچی عیدگاہ کے میدان میں ایک کثیر مجمع کے سامنے تقریر کی۔ جس میں انہوں نے نفرت دلانے اور توہین کرنے کا اقدام کیا۔ اور گورنمنٹ کے خلاف جو برٹش انڈیا میں قانوناً قائم ہے بدخواہی پیدا کرنے کا اقدام کیا۔ کہ ملزم کے ساتھ بموجب قانون بازپرس کی جائے جس کے باعث گورنمنٹ نے ازراہ مہربانی ان غازیان ملت کو گرفتار کر کے سزا دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام ہندوستان میں لاکھوں آدمیوں نے بہ بانگ دہل اس ریزولیوشن کو دہرایا۔ اور اس طرح ملک کے طول وعرض میں اس مقصد کی تبلیغ و اشاعت اس کثرت سے ہوئی کہ اگر اسے کامیاب بنانے کیلئے لاکھوں روپیہ صرف کیا جاتا تب بھی اس حد تک کامیابی ہونی ناممکن تھی۔ طرّہ یہ کہ گورنمنٹ نے ان افراد کو گرفتار نہ کر کے جنہوں نے اس ریزولیوشن کے قابل اعتراض جملوں کو

دہرایا تھا اپنی بے بسی کا صاف طور پر اقرار کر لیا۔ کیا یہ قانون کی حیرت انگیز دورنگی نہ تھی کہ ایک ہی ملک میں ایک ہی قانون کے ماتحت ایک طرف چند آدمیوں کو ایک جرم کے ارتکاب کی وجہ سے دو دو برس کی سزا دی جاتی ہے اور دوسری طرف ان لاکھوں اشخاص کی جانب سے جو اس جرم کا ارتکاب کرتے ہیں، دیدہ دانستہ طور پر چشم پوشی کی جاتی ہے۔ درحقیقت خلافت کی تحریک کو بھی اسی طرح ان سزاؤں سے قیمتی فائدہ پہنچا تھا۔ باوجود مولانا شوکت علی کے روک لئے جانے اور باوجود اس کے کہ ان کے بعد تبلیغ و اشاعت کا کام کسی قدر سست رہا۔ خود ان کی گرفتاریوں نے جو جوشِ ملی قوم کے لاکھوں افراد کے دلوں میں پیدا کر دیا تھا اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا، کہ پھر صرف ایک مرکزی آواز جیل بھر کر کوشش سے زیادہ مسلمانوں کے دلوں کو متاثر کر دیتی تھی۔ اور انگورہ فنڈ کی اپیل نے بغیر کسی خاص کوشش کے وہ گرم جوشی پیدا کر دی تھی، جس کی مثال اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آئی۔ پہلے کبھی ہندوستان کے مختلف صوبوں میں اس سرگرمی کے ساتھ خلافت کیلئے چندے فراہم نہیں کئے گئے تھے۔ جس طرح اب کی بار جمع ہوئے۔ دو مہینوں کے اندر آٹھ لاکھ روپیہ چندہ فراہم ہوا تھا۔ دراصل اس کامیابی کا راز غازیان ملت کی قید فرنگ میں پنہاں تھا۔ اور سوراج کی تحریک پر اس مقدمہ کا جو اثر ہوا تھا اس کی توضیح کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی، کہ ملک کے ہندو اور مسلمانوں میں اس مقدمہ کے باعث جو مزید حرکت پیدا کی وہ آزادئ ہند کی تحریک کیلئے نعمت ثابت ہوئی۔

تحریک خلافت کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ جب کوئی آواز کراچی سے بلند ہوتی تو اس کی تکمیل ضلع ہزارہ میں ہوتی تھی۔ بہ الفاظ دیگر یوں سمجھئے جب ملک کے اس کونے سے ابتداء ہوتی تو آناً فاناً ہزارہ میں انتہا ہو جاتی تھی۔ اکثر اوقات تو ایسا ہوتا تھا۔ کہ یہاں سے ہر معرکہ کا آغاز ہوا۔ اور کراچی میں انجام پذیر ہوا

.بہرکیف پورے ہندوستان میں کراچی اور مانسہرہ ہر دو مقامات محور و مرکز تھے ہزارہ میں جمیز شاہی اور کراچی میں ایس ایم تلافی سٹی مجسٹریٹ کی مطلق العنانی کار فرما تھی۔ "مرکزی جمعیت علمائے ہند" نے متفقہ فتویٰ جس پر ہندوستان کے علمی و مذہبی حلقوں کے چار سو چھبیس حضرات علمائے کرام کے دستخط ثبت کرا کر شائع کر دیا تھا۔ جس میں دیگر چیدہ چیدہ حضرات کے علاوہ عبدالعزیز عثمانی ساکن گڑھی حبیب اللہ تحصیل مانسہرہ (ہزارہ) کا دستخط بھی تھا اور تمام ہندوستان کے عالموں کا شرعی فتویٰ تھا۔

۱. سرکاری کونسلوں میں ممبر ہونا ناجائز ہے۔

۲. انگریزوں کی عدالتوں میں وکالت کرنا ناجائز ہے۔

۳. سرکاری یا نیم سرکاری کالجوں اور سکولوں میں تعلیم حاصل کرنا یا بچوں کو تعلیم دلانا۔ گورنمنٹ سے تعلیم میں مدد (گرانٹ) لینا ناجائز ہے۔

۴. آنریری مجسٹریٹی اور اعزازی عہدے اور گورنمنٹ کے دیئے ہوئے خطابات رکھنا ناجائز ہے۔

۵. گورنمنٹ کی تمام نوکریاں جن سے سرکار کی مدد ہوتی ہے حرام ہیں خاص کر پولیس اور فوج کی نوکری کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ کیونکہ ان کو اپنے بھائیوں پر گولیاں چلانی پڑتی ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے

وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا (سورہ نسا)

یعنی جو شخص کسی مسلمان کو عمداً (جان بوجھ کر) قتل کریگا۔ وہ جہنم میں ہمیشہ عذاب دیا جائیگا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے

من حمل السلاح علینا فلیس منا (ترجمہ) جس نے مسلمانوں کے خلاف ہتھیار اٹھائے

وہ مسلمانی سے خارج ہو گیا ۔۔۔ اور آنریری مجسٹریٹی و اعزازی عہدے بوجوہ ذیل حرام ہیں :۔

(الف) ان عہدوں سے گورنمنٹ ہند کی مدد ہوتی ہے۔ جو شرعاً حرام ہے۔

(ب)۔ اس سے گورنمنٹ ہند کے قوانین (جو بالکل مخالف شرع ہیں) کے مطابق فیصلہ ہوتا ہے جو شرعاً حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ہ

یعنی غیر شرعی فیصلے کرنے والے ظالم ہیں۔

اس فتوے پر مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی، مولانا آزاد سبحانی صاحب کانپوری، مولانا محمد داؤد صاحب غزنوی، مولانا عبدالباری صاحب لکھنوی، مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری، مولانا عزیز الرحمٰن صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند اور ہندوستان کے دوسرے بڑے بڑے عالموں کی مہر ثبت تھی (مہاتما گاندھی اور دیگر ہندو مسلمان لیڈر بھی یہی اعلان کر چکے تھے) اس فتوے کی تائید ملک کے ہر گوشہ سے ہوئی۔ کہ ہزارہ سے کراچی، پشاور سے چاٹگام، ہمالہ سے راس کماری تک کروڑوں باشندگان ملک نے جلسوں میں قرار دادوں کی صورت میں اپنے موقف کو گورنمنٹ پر واضح کر دیا۔ ضلع ہزارہ " سرزمین بے آئین " تھا۔ اور کراچی کی " انصاف گاہ " میں بغاوت کیس میں فدائے ملت مولانا محمد علی جوہر نے بعدالت سٹی مجسٹریٹ کراچی ۲۸ ستمبر ۱۹۲۱ء کو اپنے طویل تقریری بیان کے دوران میں کہا کہ

" میرے حکمران ہز ہائینس نواب صاحب رامپور پھر حضرت حضور

نظام دکن حتیٰ کہ خود اعلیٰ حضرت حضور سلطان المعظم ترکی بھی اپنی مسلمان رعایا سے کسی ایسے حکم کے ماننے کا مطالبہ نہیں کر سکتے جس کے ماننے سے قانون اسلام کی خلاف ورزی ہوتی ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مسلمانان ہند کے طرز عمل میں کوئی ایسی بات ہے اور نہ خود ہمارے رویہ میں جس سے حکومت متحیر ہو جائے۔ ہم کو خدا کا فرض بھی ادا کرنا ہے اور حکومت کا بھی۔ لیکن جب آخر کار شاہی حکومت کے مطالبات خدا کی عالمگیر حکومت سے متصادم ہو گئے۔ تو مسلمان ہونے کی حیثیت سے صرف ہم خدا کی اطاعت کر سکتے تھے۔ چنانچہ اپنی حقیر بساط کے موافق اب بھی یہی کوشش کر رہے ہیں کہ خدا کی اطاعت پر قائم رہیں۔ مسلمان کی محبت اور نفرت دونوں اللہ کی خوشنودی اور خفگی کے تابع ہیں۔ جیسا کہ پیغمبرؐ خدا نے ارشاد فرمایا ہے الحب للہ والبغض للہ۔ جب تک حکومت نے زبردستی مجبور کر کے مسلمانوں کو یہ یقین نہ دلایا کہ گورنمنٹ خدا اور اسلام کی دشمن ہے مسلمان ہر حال میں وفادار رہے۔ اور ان کی وفاداری اس حد تک پہنچ گئی۔ کہ اکثر ہمسایہ قومیں ان پر طعنہ زن ہونے لگیں۔ جو بعض اوقات بجا اور درست بھی تھا۔ لیکن گذشتہ دس سال سے اسلامی ممالک اور خصوصاً خلافت کے ساتھ جس کی اطاعت ہر مسلمان کے مذہبی فرائض میں داخل ہے۔ حکومت کا رویہ دیکھ کر اب مسلمانوں کو یقین کامل ہو گیا ہے۔ کہ حکومت مذہب اور ملک دونوں کی دشمن ہے۔ گذشتہ دوران جنگ میں جو خلافت کے خلاف اب تک جاری ہے حکومت نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ متعدد مرتبہ وعدے کئے تھے کہ مسلمانوں کے مقامات مقدسہ جو بعض عمارتیں نہیں ممالک ہیں ہر قسم کی مداخلت اور دست اندازی سے محفوظ رہیں گے اور دارالخلافہ قسطنطنیہ، سمرنا، تھریس خلیفہ ہی کے قبضہ میں رہیں گے

ان وعدوں کو اسی طرح بے پرواہی اور آسانی کے ساتھ توڑ دیا گیا۔ جس طرح مسلمانوں کو خلیفہ کی افواج کے مقابلہ میں لڑا کر ان مذہبی فرائض اور احکام کو پامال کیا گیا۔ جن کی حرمت برقرار رکھنے کا عہد مسلمانوں کی وفاداریوں کی بنیاد تھا۔ اعلان جہاد کے بعد بھی ہمارے فاقہ زدہ اور خوفزدہ سورماؤں کو جہازوں میں بھر بھر کر اس جنگ میں لڑنے کیلئے بھیجا گیا۔ جس کو ذمہ دار وزرائے مثل وزیر اعظم اور ونسٹن چرچل وزیر بحریہ نے "صلیبی جنگ" کہا ہے یہ صلیبی جنگ اب بھی جاری ہے۔ اور اس کو جاری رکھنے کیلئے حکومت نے نئے عیسائی رنگروٹ بھرتی کرتے ہیں۔ جو یونانی ہیں۔ اور جن کی ترکوں کے ساتھ کوئی لڑائی نہ تھی۔ یہ لوگ اب ترکوں کے خلاف ترکی کی سرزمین میں لڑ رہے ہیں۔ گورنمنٹ جہاں یہ شرائط التوائے جنگ کی خلاف ورزی اور ترکی پر یونانی حملہ کی ذمہ دار ہے۔ جس میں اس نے علانیہ اور خفیہ مدد کی ہے۔ وہاں ان بے شمار مظالم کی بھی ذمہ دار ہے۔ جو یونانیوں نے وہاں کئے ہیں۔ اور جن کی تصدیق اتحادی تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ سے ہوتی ہے۔ اگرچہ ہندوستانی مسلمانوں کے پاس حکومت سے تصفیہ کرنے کیلئے ذرا بھی مؤثر قوت ہوتی۔ تو اگر وہ مسلمان رہنا چاہتے۔ تو احکام اسلامی کی رو سے حکومت کے خلاف اعلان جہاد کرنے پر مجبور ہوتے۔ اور موجودہ قضیہ کا تصفیہ خالق دینا ہال کی بجائے کسی دوسری جگہ ہو رہا ہوتا۔ اگر ایسی قوت موجود نہ ہو۔ جو ایک قابل افسوس امر ہے۔ تو اسلامی قانون کی رو سے جو لوگ اپنے ملک کو خیرباد کہہ سکتے ہوں، ان کو کسی محفوظ جگہ ہجرت کر جانی چاہیئے۔ جہاں ان کو مذہبی عقاید کی بناء پر کوئی ذلیل سرکار ستانے اور پریشان کرنے والا نہ ہو۔ لیکن ان کا ارادہ یہی ہو کہ پھر واپس آ کر اپنے ملک کو آزاد کریں۔ اور خدا کی عبادت

کیلئے محفوظ و مامون بنائیں۔

اس وقت وکیل سرکار نے سٹی مجسٹریٹ کو ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۳۴۴ کی طرف توجہ دلائی، اور کہا کہ ملزم کو وہ بیان دینا چاہیئے۔ جس کا تعلق مقدمہ سے ہو۔ مجسٹریٹ نے کہا۔ کہ میرے خیال میں بھی یہ بیان ایک تقریر ہے۔ مولانا محمد علی جوہر صاحب نے کہا۔ کہ خود وکیل سرکار نے کیا کیا ہے۔ انہوں نے بھی مقدمہ پر بحث کرنے کی بجائے افسران پولیس، فوجی کرنیل، اخبار نویس اور رپورٹروں کے ایک مخلوط گروہ کو بلا کر شہادت کو پیچیدہ اور غیر واضح کر دیا ہے۔ مجھے یہ بھی نہیں بتایا کہ مجھ پر الزام کیا ہے۔ شہادت اثبات جرم کو سن کر صرف اتنا معلوم ہوا ہے کہ ہم پر ایک ریزولیوشن پاس کرنے کا جرم عائد کیا گیا ہے۔ لیکن یہ ہمارا مذہبی فرض تھا۔ جو کچھ ہم نے کیا اپنے مذہبی احکام کے مطابق کیا۔ میرے بھائی کا صرف یہ جرم ہے کہ انہوں نے اس ریزولیوشن کی موافقت میں ہاتھ اٹھایا۔ میں صرف اسلامی قانون کا پابند ہوں۔ اور اسی قانون کو بیان کرنا میرا مقصد ہے۔ جو میں کر رہا ہوں۔ میں نے مذہبی احکام بیان کرنے میں سرمو گریز نہیں کیا۔ نیز میں نے شاہان انگلستان کے اعلانات کا تذکرہ کیا ہے۔ جو یکے بعد دیگرے انہوں نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ اہل ہند کو مذہبی آزادی کا یقین دلاتے ہوئے کئے ہیں۔ میرے سامنے دو ضخیم کتابیں رکھی ہیں۔ (ایک کتاب کو ہاتھ میں اٹھا کر) ان میں اعلانات اور اسناد (چارٹر) درج ہیں۔ جو تمہارے تعزیرات ہند سے ٹکراتے ہیں۔ آخر یہ اسناد کیا ہیں؟ کیا یہ بالکل بے معنی ہیں؟ کیا ان کی کوئی قدر نہیں؟ کیا یہ محض کاغذ کے پرزے ہیں؟ اگر وکیل سرکار احکام اسلامی کی تشریح نہیں سننا چاہتے تو صاف کہہ دیں۔ دہپر میں دیکھوں گا کہ مسلمان ہندوستان سے ہجرت کرتے ہیں یا دوسروں کو ملک سے باہر کرتے ہیں۔"

۵ تم یونہی سمجھنا کہ فنا میرے لئے ہے ⁂ پر غیب سے سامان بقا میرے لئے ہے
پیغام ملا تھا جو حسینؓ ابن علیؓ کو ⁂ خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لئے ہے

(مولانا محمد علی جوہرؔ)

اس وقت مسلمانان ہزارہ کے دلوں میں ایمان کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں۔ جن کی مساعی میں دوام و استمرار تھا۔ انہیں مسلسل جدوجہد کی بناء پر فتح کا یقین محکم تھا۔ اور اس یقین کی روشنی میں جدوجہد کو آخری منزل پر پہنچا دیا تھا۔ اور میجر جیمز کے ظلم و تعدی کے باوجود غلامی کی زنجیریں توڑنے اور آزادی حاصل کرنے کے لئے کوشاں تھے وہ بخوبی جانتے تھے کہ روس اور فرانس ہمارے دشمن نہیں۔ امریکہ، جاپان اور اٹلی ہمارے دشمن نہیں ہیں۔ نہ جرمنی ہمارا دشمن ہے۔ نہ آسٹریا کہ آج ہمارے مقاماتِ مقدسہ کس کے قبضے میں ہیں؟ اور ہمارے مذہب اسلام کو کون ذبح کر رہا ہے؟ غدار شریف کو مکہ وغیرہ میں تخت پر بٹھا دیا گیا ہے۔ ان ہی انگریزوں نے اس کو تخت پر بٹھا دیا ہے۔ بصرہ اور بغداد پر کس نے قبضہ جمایا ہے؟ ان ہی انگریزوں نے کربلا و نجف اشرف اور دیگر مقدس مقامات میں یہی انگریز ہیں۔ قسطنطنیہ میں ہمارے خلیفہ کو کس نے قید کیا ہے؟ انہی انگریزوں نے۔ آج غازی ترک غازی مصطفےٰ کمال کی طرف سے لڑ رہے ہیں۔ یونانیوں نے کس نے اکسایا ہے؟ انہی لوگوں نے اور ہمارے ملک کے اندر دھارواڑ، علی گڑھ، میں خونریزی ہوئی۔ رائے بریلی اور جلیانوالہ باغ میں کشت و خون ہوا۔ ضلع ہزارہ کے مسلمانوں پر تشدد روا رکھا۔ اور خدام خلافت کو طرح طرح کی اذیتیں دیں۔ حضرت مولانا محمد اسحٰق اور ابو المعارف مولانا محمد عمر خان کو جلاوطن کیا۔ اور ضلع ہزارہ کو "سرزمین بے آئین" بنایا۔ اور راب علی برادران اور دیگر رہنمایان قوم کو خلافت کانفرنس کراچی میں ایک ریزولیوشن کی تحریک و تائید کی بناء پر گرفتار کیا۔ جیسا کہ حضرت مولانا محمد علی جوہر کے خلاف مقدمہ چلایا بظاہر یہ ہنسنے کیلئے مقدمہ تھا۔ مگر حقیقت میں حاکم و محکوم، سچ اور جھوٹ، حق اور باطل کے

مابین جنگ تھی۔ باشندگان ہزارہ تو درکنار تمام ہندوستان والوں کی نگاہیں "بغاوت کیس" کی جانب مرکوز تھیں۔ اور حضرت مولانا محمد علی جوہر نے بغاوت کیس میں بعدالت سٹی مجسٹریٹ کراچی ایس ایم تلاٹی کو یکم اکتوبر ۱۹۲۱ء کو جو تحریری بیان دیا تھا، وہ خاص تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ کہ پورے ملک کی صورت حال کی ترجمانی کماحقہٗ ادا کردی۔ اور فخر ملت مولانا محمد علی جوہر نے اپنے بیان میں کہا:۔

"مجھے تعجب ہے کہ اس حکومت نے میرے خلاف زیر دفعہ ۱۲۴ (الف) مقدمہ چلایا۔ کیونکہ یہ حکومت ایک یادگار موقع پر خود ہی انکاری احکام نافذ کر چکی تھی۔ اگرچہ اس موقعہ پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہمارے ساتھ کچھ مقابلہ کرنا چاہتی ہے جس کا اس نے اپنی طرف سے اعلان کر دیا ہے لیکن ہم نے اس کو قبول کرنے سے انکار کیا تھا۔ اس گورنمنٹ کا اعلان یہ تھا کہ جب تک ہم میں سے کوئی لوگوں کو فساد کرنے کیلئے نہ ابھارے گا ہم پر مقدمہ نہ چلایا جائیگا۔ میں دیکھتا ہوں کہ کسی گواہ نے یہ شہادت نہیں دی کہ ہم نے کسی کو فساد برپا کرنے کیلئے ابھارا۔ بلکہ سید لخت حسین صاحب جو اس مقدمہ میں گواہ کی حیثیت سے سب سے بڑے اور اہم گواہ ہیں۔ انہوں نے تو عیدگاہ کے جلسے کے متعلق یہاں تک بیان کیا ہے کہ وہاں کچھ جوش و اضطراب پیدا نہیں ہوا تھا۔ بلکہ حلفیہ یہ کہا ہے کہ خاصی گرم جوشی کا اظہار ہوا تھا۔ جس کا کم از کم ضرور مستحق تھا۔ پھر بھی میں دیکھتا ہوں کہ گورنمنٹ بمبئی نے ہماری گرفتاری کے متعلق اپنے اعلان میں ایک دو لفظ فساد کی ترغیب کے متعلق داخل کر ہی دیئے ہیں۔ جن کا منشا وائسرائے کو خجالت سے محفوظ رکھنا ہے"

مہاتما گاندھی اور وائسرائے کی قیادت میں پلیٹ فارم پر اخبارات کے ذریعہ غرضیکہ ہر طرح سے اس امر کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ اور اگر آج بھی اس کی

ضرورت ہے۔ تو میں یہاں بھی اعلان کرتا ہوں۔ کہ جب سے گورنمنٹ نے مسلمانوں کے ساتھ غداری اور پنجاب کے ساتھ ناانصافی کی ہے۔ ہم تارکین موالات کی زندگی کا مقصد یہی ہو گیا ہے۔ کہ ہم موجودہ نظام گورنمنٹ کے خلاف ایسی پُرامن بدخواہی پھیلائیں۔ جو یا تو اس گورنمنٹ کی اصلاح کر دے۔ اور یا اس کا خاتمہ کر دے۔ اسی سبب سے میں نے اپنی عیدگاہ کی تقریر میں یہ کہا تھا۔ کہ تمہارے دلوں میں موجودہ طرز حکومت کی طرف سے بدخواہی، حقارت اور نفرت ہونی چاہیئے کیا یہاں کوئی دکیل ہے؟ بھائیو! کسی کو دفعہ ۱۲۴ (الف) کے الفاظ یاد ہیں؟ اگر اس کے علاوہ بھی کوئی لفظ اس دفعہ میں ہو تو مجھ کو بتا دو۔ کہ جو کچھ میں نے کہا اور جو کچھ اس دفعہ میں ہے اور میں نے بیان نہیں کیا ہے وہ سب اس نظام حکومت کے خلاف آپ کے دلوں میں ہونا چاہیئے۔ مجھے انگریز سے نفرت نہیں ہے۔ مجھے اس سے بہت محبت ہے۔ وہ مجھے بہت ہی بھلا معلوم ہوتا ہے لیکن اپنے ہی ملک میں۔ تو اپنے ملک میں اچھا اور میں اپنے ملک میں اچھا۔ بھائی بہت زیادہ ساتھ رہنے میں فساد کا اندیشہ ہے۔

اسی تقریر میں میں نے عدم تشدد کے متعلق بہت کچھ بیان کیا تھا۔ اور لوگوں کو یہ یقین دلایا تھا۔ کہ جس طرح ہم نے بغیر کسی انگریزی قوت کے ہجوم کے سوراج کو ہاتھ سے کھویا ہے۔ ہم اسی طرح بغیر قوت استعمال کئے سوراج حاصل کر سکتے ہیں۔ بلکہ ہم کو تو اتنی قوت سے بھی کام لینے کی ضرورت نہیں جو انگریزوں نے ہمارے خلاف استعمال کی تھی۔ میں نے ہومیوپیتھک اصول کا حوالہ دیا تھا۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ جو مرض ہو اس کا اسی مرض سے علاج کیا جائے۔ اور میں نے کہا تھا۔ کہ ہندوستان کو بدیشی سوت اور کپڑے نے غلام بنایا ہے۔ لہٰذا اگر ہم اپنے کرگھے اور چرخے سنبھال لیں تو ہماری آزادی کیلئے یہی کافی ہیں۔ میں نے چرخے کو انگریزی

مشین گن سے تشبیہہ دی تھی اور فرق یہ بتایا تھا کہ اس کی مار صرف چند سو گز نہیں ہے۔ بلکہ اگر اس کا گولہ کراچی سے چھوڑا جائے تو سات ہزار میل جا کر لنکا شائر کو برباد کر سکتا ہے۔ میں نے اس امر پر بہت زور دیا تھا۔ کہ ہماری لستی جو حد درجہ بڑھ گئی ہے۔ ہرگز آسانی سے اس طرح رفع نہ ہوگی کہ ہم محض پنجاب کے سپاہیوں سکھوں۔ راجپوتوں کی سپہ گری پر اعتماد کر بیٹھیں یا فرضی افغانوں کو بلا کر سوراج حاصل کرنی چاہیئے جس میں اور بھی مشکل کا سامنا ہوگا۔ میں نے کہا تھا کہ سوراج کا مقصد (Serve no Raj) سرو نو راج یعنی کسی حکومت کی تابعداری نہ کرنا بلکہ "سب کا راج" سب کو مل کر حکومت کرنا ہے۔ سب کی حکومت حاصل کرنے کا بہترین طریقہ یہ نہیں کہ چند نفوس انتہائی قربانی کر دیں۔ بلکہ سب کو مل کر تھوڑی تھوڑی قربانی کرنی چاہیے۔ آخر میں میں نے اپنی دلیل کو یہ کہہ کر ختم کیا تھا کہ بتیس کروڑ نفوس کیلئے ایک لاکھ آدمیوں کی حکومت کو بزورِ شمشیر تباہ کرنے کا خیال دل میں لانا بزدلی ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود بھی ایک جھوٹا اعلان شائع کیا گیا ہے جس میں مجھ پر لوگوں کو فساد برپا کرنے کی ترغیب دینے کا بہتان لگایا گیا ہے۔ آخر اس کا ثبوت کیا ہے؟ عدم تشدد کے متعلق ہماری تلقین کا ثبوت تو ہر جگہ نمایاں ہے یہی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ صاحب جن کے وارنٹ پر ہم کو گرفتار کیا گیا ہے۔ یہاں صحیح سلامت کھڑے ہیں۔ ان کا بال تک کسی نے نہیں چھوا۔ یہ کس کی تلقین کا اثر ہے؟

میں اپنے بیان میں یہ مضمون لکھوانے پر اس لئے مجبور ہوا ہوں کہ آج ہم نے خدا اور انسان دونوں سے عدم تشدد کا عہد کیا ہے۔ اور میرے خیال

میں جب تک ترک موالات بلاتشدد کا پورا پورا اطمینان نہ کر لیا جائے تو تشدد کا جواب بھی ہمارے لئے بیجا ہے (اس لئے نہیں کہ گورنمنٹ کو اطمینان دلانا مقصود ہے بلکہ خدا اور اپنے ضمیر کو مطمئن رکھنے کے لئے جس کی ہم کو بادشاہ کی طرح تابعداری کرنی چاہیئے) اور چونکہ یہ امتحان ابھی پورا نہیں ہوا ہے اس لئے میں خدا کو اس بات کا شاہد بناتا ہوں (اگرچہ خدا آپ کے سامنے آکر گواہی دینے کیلئے کھڑا نہیں ہو سکتا) کہ میں نے کھڑے بیٹھے سوتے جاگتے ہمیشہ عدم تشدد کی پابندی کی ہے اور لاکھوں کو تشدد کی راہ سے باز رکھا۔

دیگر الزامات کے متعلق جن کا وارنٹ میں ذکر ہے مجھ کو بہت کم کہنا ہے۔ دفعہ ۱۲۴ (الف) میں باغیانہ توہین کا ذکر ہے لیکن میرا خیال ہے کہ توہین کا ثبوت بہم پہنچانے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ جس شخص یا جماعت کی توہین کی جائے اس کی عزت اور وقعت کا یقین لوگوں کو دلایا جائے جس کو صدمہ پہنچا ہو۔ سیکرٹری آف سٹیٹ کے متعلق تو میں کچھ نہیں کہتا صرف ان کے انڈر سیکرٹری سی ایچ اوبرش کا حوالہ دیتا ہوں۔ اور خود سابقہ وزیر اعظم انگلستان کا قول شاہد ہے کہ گورنمنٹ کے افسر اعلیٰ یعنی وزیر اعظم لائڈ جارج نے یونانیوں کو ترکوں کے وطن میں بھیج کر انگلستان و اتحادیوں کے ساتھ غداری کی ہے اس سے قبل اسلامی مقامات مقدسہ پر حملہ کر کے ایک نہایت سنجیدہ عہد توڑا گیا۔ اگرچہ گورنمنٹ اب بھی مکاری سے جو جھوٹوں کا شیوہ ہے، باز نہیں آتی ہے اور جس طرح اس کے جہازوں نے جدہ پر گولہ باری کی تھی، جس کو حملہ اور دست اندازی

سے محفوظ رکھنے کا اس نے خاص طور پر عہد کیا تھا۔ اسی طرح اب تک اس نے اعلانات اور پارلیمنٹ میں جوابات کی بھرمار کر رکھی ہے۔ ان اعلانات میں گورنمنٹ یہ ظاہر کر رہی ہے کہ جنرل النبی فلسطین میں پیدل داخل ہوئے جامع عمر کی حفاظت ہندوستان کے مسلمان سپاہی کر رہے ہیں اور مقدس عمارتوں کی کوئی بے حرمتی نہیں کی جاتی۔ اگرچہ اس قول پر ہی چند نہایت مقدس علماء و بزرگان دین نے نکتہ چینی کی ہے۔ شہدائے پنجاب کے متعلق تو میں کیا کہوں۔ میری مفروضہ مغلوبیت اور اصول ترکِ موالات سے انحراف کے بعد پایونیر نے مجھ کو یہ سمجھ کر کہ اب آئندہ کیلئے میرے لئے ذلت کا درجہ یہی ہے مجھ کو کونسل میں داخل ہونے کی دعوت دی تھی۔ میں نے عیدگاہ کی تقریر میں اس کا جواب دیا تھا۔ اور اب بھی یہی کہتا ہوں کہ میں نے جو اس وقت کہا تھا کہ جو کونسل میں داخل ہوتا ہے۔ اس کو پہلے امرتسر کی گلی میں پیٹ کے بل رینگنا پڑتا ہے۔ اور باہر اس کے اعزازی گارد کا کام میانوالی کی وہ عورتیں دیتی ہیں جن کی بے حرمتی ایک مردود شخص نے کرنی چاہی تھی۔ اور دھمکی یہ دی تھی کہ ہم اپنی وفادار پولیس سے تمہارے لہنگے اتروائیں گے۔

اگر اس گورنمنٹ کی کبھی کچھ عزت اور وقعت تھی بھی تو وہ مقامات مقدسہ اور پنجاب میں ضائع ہو چکی اور اب اس گورنمنٹ کو لوگوں کی نظروں میں حقیر اور ذلیل کرنا میرے شایان شان نہیں

برطانوی وزارت نے انگلستان میں اور ان گرگوں نے جن کو محض دھوکا دے کر کسی طرح مسلمانوں کو خاموش رکھنا مقصود ہے۔ ہندوستان میں اوڈائر اور اوڈوائر دونوں نے پنجاب میں اپنا کام خوب کیا۔

مجھ کو انصاف کی کوئی امید نہیں جس گورنمنٹ نے خدا اور رسولؐ کے ساتھ انصاف نہ کیا، ترکوں اور پنجابیوں کے ساتھ انصاف نہ کیا۔ اس سے انصاف طلب کرنا میرے لئے گناہ عظیم ہے۔ اور اگر مجھ کو کبھی اس سے انصاف کی امید بھی تھی تو اس کا بھی اس وقت خاتمہ ہو گیا۔ جب کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ وزیگاپٹم نے جس کا کام قانون کی حفاظت کرنا ہے نقص امن کے خوف کا بہانہ بنا کر والٹیر میں مجھے گرفتار کیا۔ اور یہ ظاہر کر کے کہ نقص امن کو روکنے کے لئے بجز میری گرفتاری کے کوئی دوسری صورت ہی ممکن نہ تھی۔ قانون سے ناجائز کام لیا۔ حالانکہ میں نے ان مقامات میں بھی کبھی نقص امن نہیں کیا تھا۔ جہاں مجھ کو مہینوں قیام کرنے کا اتفاق ہوا۔ اس تمام ناجائز طرز عمل کی غایت یہ تھی کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کراچی کے اہم کام کو پورا کیا جائے۔ جن کے وارنٹ میں تاخیر ہونے کی وجہ سے میری گرفتاری چودہ دسمبر کو نہیں ہو سکی۔ اور میں اپنے مالابار کے غریب اور جوشیلے بھائیوں یعنی موپلاؤں کو ٹھنڈا کرنے اور سمجھانے کیلئے روانہ ہو گیا تھا۔ جن سے چند خطائیں سرزد ہو رہی تھیں۔

جب انہوں نے دفعات ۷ ۱۰، ۱۰۸ تعزیرات ہند کے ماتحت چارہ جوئی موقوف کر دی تو میں نے ان سے ان کا حقیقی منشاء دریافت کیا۔ اس پر انہوں نے یہ کہہ کر شیطان کو بھی مات کر دیا۔ کہ میرا منشاء کوئی مزید کارروائی کرنے کا نہ تھا۔ بلکہ مجھ کو صرف کراچی سے وارنٹ وصول ہونے کا انتظار تھا۔

پس مجھ کو یہی کہنا ہے کہ اگر گورنمنٹ یہ معلوم کرنا چاہتی ہے کہ وہ ہندوستان کے ساتھ کوئی تعلق یا رشتہ کن شرائط پر قائم رکھ سکتی ہے تو میرا جواب یہ ہے کہ اپنے دل میں تغیر پیدا کرے جس کا ثبوت اس بات سے مل سکتا ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی مطالبات پورے کئے جائیں۔ پنجاب سے انصاف کیا

جائے۔ اور ہندوستان میں ایسی حکومت قائم کی جائے۔ جس کی بنا فقط احکامِ خداوندی کے احترام اور لوگوں کی مرضی پر ہو۔ اس طرزِ عمل سے گورنمنٹ کو کوئی مادی نقصان نہیں پہنچتا۔ لیکن اگر وہ اپنے موجودہ رویّہ پر مصر رہے تو مجھے اس کا بھی وہی حشر معلوم ہوتا ہے۔ جو اس سے قبل اس سے بڑی بڑی بابل اور مصر جیسی عظیم الشان سلطنتوں کا ہو چکا ہے۔ جن کو خدا کی ہمسری کا دعویٰ کرنے پر نیست و نابود کرنے کیلئے ایک حقیر مچھر اور دریا کی موج کافی ہوئی"

۵

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

(مولانا محمد علی جوہر)

کراچی پولیس کی شکایت پر مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو مولانا حسین احمد مدنی، پروفیسر غلام مجدد، مولانا نثار احمد کانپوری، شنکر اچاریا جی شاردا پیٹھ کو گرفتار کیا گیا تھا۔ اور گرفتاری کے وقت مولانا محمد علی جوہر مسٹر گاندھی کے ساتھ امن کے مشن پر مالابار جا رہے تھے۔ پروگرام کے مطابق انہیں والٹر ریلوے سٹیشن کے باہر ایک جلسہ عام سے خطاب کرنا تھا۔ جہاں گاڑی نصف گھنٹہ ٹھہرتی تھی۔ لیکن اس تقریر کی نوبت نہ آسکی۔ اور عدالت نے اس مقدمہ میں مولانا محمد علی جوہر اور ان کے رفقاء کو ہر الزام کے تحت دو دو سال کی قید سخت کی سزا دی۔ صرف شنکر اچاریہ کو بری کر دیا گیا تھا اور اس طرح یہ تاریخی مقدمہ یکم نومبر کو اختتام پذیر ہوا۔ اور ۱۹۲۳ء میں مولانا رہا ہوئے۔ تو انہوں نے اپنے اخبار "کامریڈ" اور "ہمدرد" دوبارہ جاری کئے۔

یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ٹھنڈے دل و دماغ کے افراد پُرسکون ماحول میں تو خوب چلتے

ہیں۔ لیکن طوفان میں ان کے بادبانوں سے ہوا نکل جاتی ہے۔ اور طوفانی تحریکوں کو چلانے اور زندہ رکھنے کیلئے جذباتی شخصیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ حضرت مولٰنا محمد اسحٰق، مولٰنا ابوالمعارف محمد عرفان اور مولٰنا محمد علی جوہر اور ان کے بھائی مولٰنا شوکت علی ہنگامہ خیز تحریکوں کے رہنما تھے۔ اور اس لحاظ سے ان کا جذباتی ہونا تحریک اور ملک و ملت کیلئے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھا۔

برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کو دنیائے اسلام میں اس بات کا فخر حاصل ہے۔ کہ جب کبھی اور جہاں کہیں مسلمانوں پر کوئی ظلم و تشدد ہوا۔ یا کوئی ناانصافی کی گئی۔ انہوں نے یوں محسوس کیا جیسے اس مصیبت کا وہ خود شکار ہوئے ہیں۔ مصر و سوڈان ہو۔ یا الجزائر و مراکش، طرابلس اور بلقان ہو یا حجاز و ترکی۔ جہاں بھی "ملت اسلامیہ" پر کوئی آفت آئی۔ برصغیر کے مسلمانوں نے دامے درمے قدمے سخنے اپنی بساط سے بڑھ کر ان کی مدد کی۔

یہ مسلمانوں کی تاریخ کا انوکھا واقعہ ہے۔ کہ جب ترکی میں "خلافت اسلامیہ" کی آخری یادگار انگریز اور دوسری مغربی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں اور ہوس ملک گیری کے چنگل میں آخری سانسیں لے رہی تھی۔ اور برصغیر پاک و ہند کے مسلمان انگریز کی غلامی کی زنجیروں میں پابند ہونے کے باوجود اسلام کے غلبہ و اقتدار کی اس ٹمٹماتی شمع کو فروزاں رکھنے کیلئے دیوانہ وار اپنا خون پیش کر رہے تھے۔ اور دنیائے عرب نے خلافت کے اس آخری نشان کو بچانے اور اس کی پشت پناہی کرنے کی بجائے سامراجی طاقتوں کے اشارے پر اس کے تابوت میں آخری کیل گاڑ دی۔ اور خلافت کا خاتمہ کر دیا۔

تحریکِ ہجرت

ے

تلوار خوں میں رنگ لو ارمان رہ نہ جائے
بسمل کے سر پہ باقی احسان رہ نہ جائے
ساقی! میں تیرے قرباں اک جام تو پلادے
تیرے وصل کا پیاسا مہمان رہ نہ جائے

تحریک مخالفت رولٹ ایکٹ کی ہنگامہ آرائی ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ مسئلہ خلافت اور انگریزوں کے خلافت عثمانیہ کے خلاف اقدامات اور ارادوں کا اجراء ہوا، تو اس سلسلے میں لکھنؤ سے ایک آواز اٹھی کہ مسلمانانِ ہند کیلئے جب مخالف طاقت کے خلاف جارحانہ اقدامات کی طاقت نہ ہو تو اسے وطن سے ہجرت کر جانا چاہیئے۔ یہ نعرہ مذہبی رنگ لئے ہوئے بلند ہوا تو اسلامیانِ ہند نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیتے ہوئے ملک سے نکل جانے کا فیصلہ کیا۔ اور چونکہ افغانستان سے زیادہ کوئی دوسرا ملک قریب نہ تھا اس وجہ سے کابل کو ہجرت کرنا مناسب سمجھا۔

ہمارے علمائے کرام جذبات کی رو میں ڈوب کر واقعات، حالات یا نزاکت وقت کے پس و پیش کو قطعاً وقعت نہ دیتے ہوئے فتوے صادر کرتے رہے ہیں چنانچہ اس موقع پر بھی "ہجرت" کا نعرہ تو لگا دیا گیا لیکن کسی نے یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ آخر ان مہاجرین کا انجام کیا ہوگا؟ کیا افغانستان جیسے چھوٹے سے ملک میں یہ سب لوگ کھپ سکتے تھے؟ کیا ایسی حالت میں کہ افغانستان کو تازہ تازہ آزادی ملی تھی اور ابھی

جنگ میں لگے ہوئے اس کے زخم بھرنے نہ پائے تھے۔ وہ ان مہاجرین کی وجہ سے دوبارہ اعلان جنگ کر سکتا ہے؟ مختصر یہ کہ مستقبل سے قطعاً آنکھیں بند کئے مسلمانوں کو ہندوستان سے ہجرت کر جانے کا شرعی حکم دیا جاتا رہا۔ اور اس طرح کہ حکم دینے والے خود اپنے مسکنوں سے بھی ہل نہ سکے جب ہجرت کا اعلان ہوا تو اس کا سب سے زیادہ اثر باشندگان سرحد نے لیا۔ گو اس علاقے میں کسی منظم جماعت۔ یا علماء کی جمعیت نے یہ فتولے نہ دیا تھا پھر بھی ہندوستانی علمائے کرام کی عزت و وقعت کے پیش نظر اس حکم کو حکم شریعت اسلامیہ تسلیم کیا گیا۔ پورے صوبہ سرحد کے طول و عرض میں ایک آگ سی جلتی نظر آنے لگی۔ جسے دیکھو بوریا بستر سنبھالے یا اپنا گھر بار لٹائے افغانستان کی جانب ہجرت کرنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ دلدوز اور المناک مناظر نظر آنے لگے۔ کہ جن کے تصور سے ہی بدن میں رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس وقت والدین سے ان کے لخت جگر جدا ہوئے خاوندوں سے بیویاں اور بیویوں سے خاوند جدا ہوئے۔ والدین یا سرپرستوں کے یوں راہ حق میں رخصت ہونے پر ان کے بچے تلملائے تھے۔ چشم گریہ ماؤں کی گود میں ننھے ننھے بچے جو زار و قطار روتے ہوئے ہجرت کرنے والے والد سے چمٹ جانا چاہتے تھے پھر وہ دردناک نظارے بھی دیکھے گئے۔ جبکہ سڑکوں پر نکاح پڑھے گئے۔ یہ جوڑے اسلام کے نام پر شب عروسی کو ملتوی کئے رسومات شادی کو یک قلم فراموش کرتے ہوئے میدان جہاد کی طرف گامزن تھے تحفظ اسلام کیلئے تیز روی سے چل رہے تھے گھر بار لٹ گئے۔ فصل برباد ہوئی عزیزوں و تعلقداروں سے اس امید میں جدائی ہوئی کہ وہ بھی جلد ان سے میدان جنگ میں جا ملیں گے۔ کھڑی فصلیں کوڑیوں کے مول فروخت کر دی گئیں۔ ہندو موقع سے فائدہ اٹھانے کیلئے موجود تھے۔ انہوں نے دو دو روپے میں گائے خریدی مختصراً ایک قیامت صغریٰ کا نظارہ تھا۔ لیکن دیکھنے والوں کیلئے جانے والے ہنسی خوشی تیز تیز قدم اٹھائے

تھے۔ تاکہ حکم خدا و رسولؐ کی پیروی میں وہ اسلام کا تحفظ کر سکیں۔

یہ تحریک ہجرت کسی باقاعدہ جماعت کی طرف سے شروع نہ ہوئی تھی۔ گو مجلس خلافت کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ لیکن اس تحریک سے براہ راست کوئی تعلق نہ تھا۔ چند علماء کے ذاتی خیالات اور فتووں نے یہ آگ لگا دی تھی۔ جسے پھر خود انہوں نے سنبھالنے یا اس کیلئے کسی نظم کو ضروری خیال نہ کیا۔ افغانستان کا راستہ چونکہ پشاور سے ہی ہو کر جاتا تھا۔ اس وجہ سے مہاجر پشاور کا رخ کرنے لگے۔ کوہاٹ اور بنوں کے راستے سے بھی مقامی یا اس علاقہ کے باشندے افغانستان کی جانب جاتے رہے۔ لیکن کثرت تعداد کیلئے پشاور کا راستہ موزون و مناسب تھا۔ جب کسی مرکزی مجلس کو تحریک کی سرپرستی حاصل نہ تھی۔ تو پشاور میں مہاجرین کے آرام و سہولت کا کون انتظام کرتا۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ خود پشاور کے باشندے جلد از جلد اس "دار الحرب" سے نکل جانے کے متمنی تھے۔

گرد و نواح سے چھوٹے چھوٹے قافلے آتے اور پشاور میں مقیم رہ کر رخصت ہو جاتے ایسی حالت میں باشندگان پشاور کی غیرت کو ٹھیس لگی۔ ان کے جذبہ مہمانداری پر تازیانہ پڑا۔ تو قدرت نے سامان پیدا کر دیا۔ پشاور کے ایک مشہور ٹھیکیدار حاجی جان محمد میدان میں نکل آئے۔ اس کے بعد انہیں معاون کی حیثیت سے سید مقبول شاہ، مرزا محمد سلیم خان منشی عبد الکریم وثیقہ نویس، اور نوجوانوں میں یوسف علی خان اور حکیم قطب عالم جیسے کارکن مل گئے۔ ہجرت کمیٹی کے نام سے ایک جماعت منظر عام پر آ گئی۔ تو اس نے مہاجرین کے طعام و قیام کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ رضا کاران خلافت کی اچھی خاصی تعداد خدمت کیلئے موجود ہو گئی۔ امراء و غرباء کے بچے اور نوجوان اور کئی عمر رسیدہ افراد نے "سبز رنگ" کی پٹیاں زیب تن کر لیں۔ اور باشندگان پشاور نے بھی حسب ضرورت دعوتا پیش کرنی شروع کر دیں۔ نمک منڈی (پشاور شہر) میں متعدد سرائیں خالی کرا لی گئیں

جن میں مہاجرین کو ٹھہرایا جاتا تھا۔ وہ ایک دو روز کے بعد رخصت ہو جاتے تھے انہیں کھانے پینے اور دوسری ہر قسم کی سہولت پہنچائی جاتی رہی تھی۔ اور رضاکاران خلافت شب و روز ان کی خدمت میں مسرت و انبساط محسوس کرتے تھے

ابتداء میں مہاجرین کے چھوٹے چھوٹے قافلے آتے رہے۔ بعد میں ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور یہ تعداد سینکڑوں تک جا پہنچی۔ اور تحریک نے زور پکڑا۔ تو ایک ایک قافلے میں دس دس ہزار سے بھی زیادہ مہاجرین کے طعام و قیام کا انتظام ناگزیر ہو گیا اسی دوران میں تحریک نے سندھ کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سندھیوں کے قافلے بھی مختلف راستوں سے رخصت ہونے لگے۔ اور ایک بہت بڑا قافلہ سندھ کے مشہور قائد جان محمد جونیجو بیرسٹر کی قیادت میں پشاور پہنچا۔ یہ قافلہ ایک سپیشل ٹرین کے ذریعے آیا تھا۔ پشاور میں اس قافلے کا شاہانہ استقبال ہوا۔ جلوس نکالا گیا۔ اور چند روز پشاور میں مقیم رہنے کے بعد یہ سندھی مہاجرین براستۂ خیبر عازم افغانستان ہو گئے۔

یہ امر قابل غور ہے کہ ان ایام میں باوجودیکہ ہر مسلمان کے دل میں انگریز کیخلاف جذبات ناقابل برداشت حد تک ابھرے ہوئے تھے اور ہر شخص بخوبی جانتا تھا کہ یہ تحریک ہجرت انگریزوں کے مظالم ہی کی وجہ سے ہو رہی ہے۔ لیکن بایں ہمہ مسلمانوں نے صبر و تحمل سے کام لیا۔ کہ اس ایسے موقع پر تاریخ میں اتنے امن و سکون کی شاید ہی کوئی مثال مل سکے۔ صوبے بھر میں کسی قسم کی بدامنی نہ ہوئی۔ اور حکومت کو کسی وقت بھی نقص امن یا فساد کا بہانہ نہ مل سکا۔

برصغیر پاک و ہند میں تحریک خلافت کے دوران ہی "تحریک ہجرت" شروع ہوئی اس زمانہ میں کابل کا حکمران امان اللہ خان تھا۔ ہر جلسہ میں والئ کابل کی دعوت کو دہرایا جاتا کہ مسلمانان ہند کو امان اللہ خان "دعوت ہجرت" دے رہے ہیں

اور ہر ایک پیر و جوان کے لب پر یہ اشعار سنائی دیتے تھے ؎

سلام لو ہم مسافروں کا کہ ہم تو کابل کو جا رہے ہیں
کسی کے ظلم و ستم کے ہاتھوں وطن کی الفت مٹا رہے ہیں

رہے تو برطانیہ سلامت ہو تجھ پہ لعنت تری حکومت
غریب مسلم شکستہ قسمت پیام ہجرت سنا رہے ہیں

برادرانِ ہنود تم کو مبارک ہوئے وطن کی راحت
دلیر مسلم تمہارے بھائی سفر کا بیڑا اٹھا رہے ہیں

تمام قصوں کو چھوڑ حافظ تعلق اب حق سے جوڑ اپنا
وطن کے جھگڑوں کو چھوڑ حافظ امیر کابل بلا رہے ہیں

بس کیا تھا۔ کہ سندھ، پنجاب، اور صوبہ سرحد سے لاکھوں مسلمان آمادۂ ہجرت ہو کر جانب کابل روانہ ہوئے۔ اور تحصیل مانسہرہ میں تحریک ہجرت اسی طرح زور شور سے شروع ہوئی۔ جس طرح تحریکِ خلافت برپا ہوئی تھی۔ جس وقت قافلۂ ہجرت اپنے سالار کی زیر قیادت روانہ ہوتا۔ تو مسلمان ان کے لئے پارچات ہر قسم اور سامان خورد و نوش و زادِ راہ دلی شوق سے پیش کرتے۔ اور روانگی کے وقت مرد و زن زار و قطار آنسو بہاتے تھے۔ مانسہرہ (ہزارہ) سے سب سے پہلے قافلہ کے سالار مولنا مقبول الرحمٰن سکونتی شہیلیہ تھے۔ جو تحریک خلافت کے سرگرم کارکن تھے۔ ان کے بعد مزید دو قافلے روانہ ہوئے۔ اور بہت مخلص مسلمانان ضلع ہزارہ و سرحد اور پنجاب و سندھ نے اپنی جائدادیں فروخت کر کے راہِ خدا میں ہجرت کی۔ جس کا صحیح خاکہ اس دور کی تاریخی نظموں میں نظر آتا ہے۔ ؎

خدایا کیسی مصیبتوں میں یہ اہل ہند والے پڑے ہوئے ہیں
قدم قدم پہ ہماری خاطر ستم کے جالے پڑے ہوئے ہیں

وہ آئے مہماں ہمارے بن کر وہ ظلم کرنے لگے ہمیں پر
غضب تو یہ ہے مکاں سے باہر مکان والے پڑے ہوئے ہیں
تمام بچوں کے باپ بچھڑے تیغ دشمن سے ہو کے ٹکڑے
سہاگنوں کے سہاگ اجڑے گھروں کو تالے جڑے ہوئے ہیں

تحصیل ہری پور سے سب سے پہلے قافلہ کی سرکردہ شخصیت محمد اکبر خان قریشی تھے۔ اسی تحصیل ہری پور کی معروف و مشہور شخصیت مہدی زمان خان رئیس کھلابٹ جنہوں نے تحریک خلافت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے تحریک ہجرت میں بھی نہایت گرمجوشی سے اپنے اخلاص عمل کا ثبوت دیا۔ اور تحصیل ایبٹ آباد سے قافلے روانہ ہوئے جن میں عبداللہ خان سکوتی عشنڈیانی جیسے سرکردہ حضرات شامل تھے سیالکوٹ سے ایک قافلہ پنجاب کی مقتدر شخصیت آغا محمد صفدر کی قیادت میں پشاور پہنچا۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے ملک کی مختلف اطراف سرحد، سندھ اور پنجاب سے قافلے افغانستان روانہ ہوئے۔

تھوڑے ہی عرصے کے بعد ردّ عمل شروع ہوا۔ ہر مہاجر کو یقین تھا کہ جس طرح پشاور میں ان کی آؤ بھگت ہو رہی تھی، ویسی ہی افغانستان میں ہو گی۔ کابل جیسا مختصر شہر آخر کتنوں کو اپنے اندر جذب کر سکتا تھا۔ علاوہ ازیں ہر مہاجر نے اسلحہ طلب کیا، بارود طلب کیا۔ تاکہ انگریزوں کے خلاف محاذ جنگ قائم ہو۔ حکومت افغانستان نے تھوڑے ہی عرصے قبل جنگ سے نجات حاصل کی تھی۔ اسے آزادی مل چکی تھی۔ دوبارہ آتش جنگ میں کیونکر کود سکتی تھی۔ بعض باشندگان افغانستان نے بھی کچھ بے رخی برتی۔ تو مہاجرین میں بددلی پھیلنے لگی۔ ان میں باہمی اختلافات شروع ہوئے۔ وہ ٹولیوں میں بٹ گئے۔ اس طرح کچھ تو مصائب کے مقابلے کی تاب نہ لا کر داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ جن کی غیرت نے واپس لوٹنا گوارا نہ کیا۔ وہ تو افغانستان میں مقیم ہو کر محنت مزدوری سے پیٹ بھرنے لگے۔ یا مارے

مارے بلا منزل کا تعین کئے اِدھر اُدھر پہاڑوں میں سے ۔ پھوڑنے لگے۔

اس دورِ ہجرت میں انگریز روس کی اس جدید طاقت "بالشویک" سے حد درجہ خائف نظر آتا تھا۔ اور ہر وہ شخص جو "بالشویکوں" سے تعلق رکھتا۔ تو کجا اس کی نسبت کسی اچھے خیال کا اظہار بھی کر دے گردن زدنی سمجھا جاتا تھا۔ اسی دوران میں یہ "بالشویک" وسط ایشیا کی سلطنت بخارا کے خلاف نبرد آزما ہو چکے تھے اس علاقے اور افغانستان میں بھی ان (بالشویکوں) کو عام طور پر "جدیدی" پکارا جاتا تھا۔ تو ان سے میل ملاپ تو گویا ایک ناقابل معافی گناہ تھا۔

"بالشویک"۔ روسی زبان میں اس کے معنی اکثریت کے ہیں، ۱۹۰۵ء میں جب اشتراکیوں کی کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ تو اس میں اکثریت پارٹی اپنی کثرت کی وجہ سے "بالشویکی" پکاری گئی۔ کچھ عرصے بعد جا کر اس لفظ کا استعمال عام ہوا۔ تو سب کمیونسٹ (اشتراکی) کے نام سے بھی موسوم ہونے لگے۔

اس پس منظر کے پیش نظر جو مہاجرین افغانستان سے ہی واپس لوٹ آئے تھے ان کے خلاف تو حکومت خاموش رہی۔ بلکہ سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان کی سعی سے حکومت نے ان کی فروخت شدہ املاک ہندوؤں سے واپس کرا دیں اور انہیں سرکاری امداد دے کر پھر زندگی گزارنے کے قابل کر دیا تھا۔ لیکن وہ مہاجر جو روس یا بخارا یا ایران کی طرف اقدام کرنے کے بعد واپس لوٹے۔ انہیں اگر ہمارے علماء نے کافر کہا تھا تو حکومت نے "بالشویک ایجنٹ" قرار دیدیا۔ اس طرح وہ دو دھاری تلوار سے کاٹے گئے۔ ان افراد میں میاں اکبر شاہ پشاوری بھی تھے واپسی پر انہیں بھی چند مہینے جیل میں رہنے کے بعد دو سال قید سخت سنا دی گئی۔ اور محمد اکبر خان قریشی سکونتی ہری پور ہزارہ تین سال کیلئے قید میں ڈال دیئے گئے۔ اور ابھی وہ اس سزا کو مکمل نہ کر پائے تھے۔ کہ اسی الزام "بالشوزم" میں مزید دس سال قید کر دیئے گئے۔

حالات سے پتہ چلتا ہے۔ محمد ایوب خان سکونتی بٹل تحصیل مانسہرہ ہزارہ جو تحریک خلافت سے کئی سال پہلے حکومت انگریزی سے قطع تعلق کرکے کابل جا چکا تھا۔ مہاجرین میں اغلبًا اولیت کا اسے شرف حاصل تھا۔ وہ اپنی کافی جائداد، جاگیر اور نمبرداری پر لات مار کر افغانستان میں پناہ گزین ہوئے اور وہیں وفات پائی۔ جب کابل میں دو لاکھ انسانوں کیلئے مناسب انتظام نہ ہو سکا تو بامر مجبوری یکے بعد دیگرے مہاجرین واپس ہندوستان آگئے۔ اور مولینا فضل ربی ہزاروی آخری دم تک حدود حکومت انگریزی میں داخل نہ ہوئے۔ اور وہیں وفات پا کر راہئ ملک عدم ہوئے۔ جن مہاجرین نے افغانستان سے نکل کر ترکی پہنچنے کا ارادہ کیا تھا۔ ان کی بہت ہی محدود تعداد ہندوستان کو واپس لوٹی۔ مولٰنا عبدالحنان ہزاروی ایک جید عالم تھے۔ انہوں نے ترکی میں قیام کیا تھا۔ اور جن دنوں اول جنگ کے بعد حجاز میں باہمی کش مکش شروع تھی۔ انہوں نے "مسئلہ حجاز" کے نام سے اردو میں ایک اہم پمفلٹ لکھا تھا۔ جسے دنیائے عرب نے نہایت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا تھا۔

عبدالعزیز اور عبداللہ جان پسران میاں عبدالغفور پشاور کے ایک معزز گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ وہ مصائب و آلام کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے عزم و ارادے میں ثابت قدم رہے۔ دونوں نے روس کی راہ لی تھی۔ جہاں عبداللہ جان ترکی پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ اور اسی سرزمین پر وفات پا کر سپرد خاک ہوئے۔

دوسرے عبدالعزیز نے روس میں قیام کیا۔ ہر دلعزیزی حاصل کرنے کے بعد ادارۂ حکومت میں شامل ہو گئے۔ اور حکومت روس کی طرف سے کچھ عرصہ امریکہ میں بھی مقیم رہے اور روس ہی میں وفات ہوئی۔ ان ہر دو حضرات کے دیگر دو بھائی عبدالحیٔ خان اور عبدالحمید خان قابل ذکر اور آج کل پشاور میں مقیم ہیں۔ انہوں نے بعد میں تحریک خلافت، نوجوان بھارت سبھا اور تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا۔

فضل قادر قریشی بن حکیم محمد عالم بھی پشاور شہر سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ترکی جا پہنچے

وہیں بود و باش اختیار کی اور غالباً وہ "القرہ ریڈیو" سے وابستہ ہیں۔ ان کے بھائی قطب عالم نے بھی تحریک ہجرت میں نمایاں کام کیا۔ پشاور شہر کے ایک اور نوجوان قاضی عبدالکریم کی نسبت روایت ہے کہ وہ اول افغانستان میں رہے۔ بعد میں ایران چلے گئے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ واپس بھی لوٹے تھے۔ لیکن زیادہ عرصہ قیام نہ کیا۔ اور عراق میں جا کر مستقلاً قیام پذیر ہو گئے۔

ایک اور عبدالکریم جو ضلع کوہاٹ کے باشندے بیان کئے جاتے ہیں۔ ہجرت میں کابل سے ہوتے ہوئے روس جا پہنچے اور وہاں انہوں نے ہوائی پرواز میں نمایاں حیثیت حاصل کی تھی۔ اور ۱۹۲۵ء میں وفات پا گئے۔ روس میں قیام کرنے والوں میں محمد اکبر خان قریشی ضلع ہزارہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ کہ طویل عرصہ قیام کے باعث وہاں خاص عزت سے دیکھا جاتا تھا۔

مہاجرین میں بعض اصحاب کا تعلق صوبہ پنجاب سے تھا۔ ان میں سے بھی بعض حضرات لوٹ کر اپنے وطن میں "بالشویک" ہونے کی وجہ سے حکومت کے زیر عتاب رہے۔ جو باہر رہے۔ ان میں اقبال شیدائی نے جو زیادہ تر روم اور اٹلی میں رہے نام پیدا کیا۔ اللہ نواز خان جو غالباً ڈیرہ غازی خان کے باشندے تھے۔ ان کی قسمت کا ستارہ یہیں سے چمکا۔ آپ افغانستان میں مقیم رہے۔ اور وہاں کی سیاست کے نشیب و فراز میں دوڑتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ جب محمد نادر شاہ برسر اقتدار آئے تو اللہ نواز خان کو وزارت کی کرسی پر دیکھا گیا۔ بعد میں انہیں جرمنی میں افغانستان کے سفیر کی حیثیت سے متعین کر دیا تھا۔ اسی طرح افغانستان کے مذہبی و سیاسی حلقوں میں مولانا فضل ربی ہزاروی کی حیثیت نمایاں تھی۔ حاجی جان محمد جونیجو جو سندھی مہاجرین سے بھری ہوئی ٹرین لیکر پشاور پہنچے تھے کچھ عرصہ افغانستان میں مقیم رہنے کے بعد واپس سندھ لوٹے۔ مابعد آپ نے دوبارہ بیرسٹری شروع کرنے کی بجائے حجاز کی راہ لی۔ اور وہیں مقیم ہو کر فرشتۂ اجل کو

لبیک کہا اور اسی سرزمین میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ابدی نیند سو گئے۔

انگریزوں کو چونکہ سب سے زیادہ اور شدید مخالفت مولنا محمد علی جوہر سے رہی ہے۔ اس وجہ سے انگریز کے خلاف ہر اقدام کے جرم کو وہ محمد علی جوہر ہی کے کھاتے میں لکھتے رہے۔ جب حالت یہ ہو تو ہجرت کے مسئلے میں محمد علی جوہر کو کیوں ملوث نہ کیا جاتا۔ چنانچہ مشہور مصنف سر تھیوڈر ماریس نے لکھا ہے کہ

"محمد علی نے انگلستان سے واپس آکر مسلمانوں کو ورغلایا کہ وہ افغانستان کی طرف ہجرت کر جائیں"۔

اور دوسرے پروفیسر گب نے گو اپنی کتاب "وہیر اسلام" میں محمد علی کا نام تو نہیں لکھا لیکن مندرجہ بالا خیالات کی پوری پوری تائید کر دی۔ درحقیقت "تحریک ہجرت" اس وقت شروع ہوئی جب مولنا محمد علی جوہر قائد وفد خلافت کی حیثیت سے یورپ میں مقیم تھے۔ اور "تحریک ہجرت" ستمبر سنہ ۱۹۲۰ء میں ختم ہو چکی تھی۔ جبکہ مولنا محمد علی جوہر اکتوبر سنہ ۱۹۲۰ء میں یورپ سے واپس لوٹے تھے۔ بہ الفاظ دیگر "تحریک ہجرت" مولنا محمد علی جوہر کی عدم موجودگی میں شروع ہو کر "جون، جولائی اور اگست سنہ ۱۹۲۰ء" میں جوش دکھلانے کے بعد مولنا محمد علی جوہر کی واپسی سے قبل ہی ختم ہو گئی تھی۔ یہ اقدام کسی تنظیم کے تحت شروع نہ ہوا تھا۔ مذہبی جذبات کی رو میں مسلمان بہنا شروع ہوئے تو باشندگان صوبہ سرحد نے "مہاجر و انصار" دونوں فرائض کماحقہ، ادا کئے۔ ان حالات میں جب تحریک ہجرت نے زور پکڑا تو جمعیت خلافت مرکزیہ اس طرف متوجہ ہوئی، تاکہ اسے کسی نظام کے تحت چلایا جائے۔ اور ضروری خیال کیا گیا کہ اس سلسلے میں اول حکومت افغانستان سے جملہ معاملات طے کر لئے جائیں۔ چنانچہ مولنا شوکت علی صدر مجلس خلافت ہندوستان نے حکومت افغانستان کے نمائندے مقیم ہند کے نام اپنا پہلا خط دس اگست سنہ ۱۹۲۰ء کو ارسال کیا۔ اس وقت تک ہندوستان میں

"افغانستان سفارت" پوری طرح منظم نہ ہو پائی تھی۔ خط و کتابت میں کچھ وقت ضائع ہوا۔ تو ادھر اس دوران "تحریک عدم تعاون" نے ہمہ گیر صورت اختیار کر لی۔ ادھر ستمبر تک "تحریک ہجرت" خود بخود موت کی نذر ہو گئی۔ تو مزید خط و کتابت کی ضرورت ہی باقی نہ رہی تھی۔

صوبہ سرحد میں "تحریک عدم تعاون" کے شروع کرنے کو زمین پہلے سے تیار تھی۔ "تحریک ہجرت" ملک میں زندگی کی لہر اور برطانوی حکومت کی مخالفت کا ہمہ گیر جذبہ پیدا کر چکی تھی۔ جو لوگ گھر بار لٹا کر وطن اجداد سے ہجرت کر سکتے تھے ان کے سامنے انگریز حکومت سے عدم تعاون کا مسئلہ کوئی خاص اہمیت نہ رکھتا تھا۔ پھر یہ کہ صوبہ سرحد کی قومی تحریکات کا جائزہ لیا جائے۔ تو ہر ہر موقع پر اس کے فروغ میں انگریز کی اپنی ذات دکھائی دیتی ہے۔ چنانچہ اس موقع پر بھی کہ "جمعیت خلافت" نے حکومت سے عدم تعاون کا باقاعدہ اعلان نہ کیا تھا۔ کہ خداوندان حکومت سرحد کی حماقت سے خلافت کے نام پر پنڈت امیر چند بموال اور حکیم عبدالجلیل ندوی زیر دفعہ ۱۲۴ سرحدی گرفتار کر لئے گئے۔ اور "تحریک خلافت" میں ان دونوں کو گرفتاری میں اولیت کا فخر حاصل ہوا۔ مسلمانوں کی تحریک اور صوبہ سرحد میں کسی ہندو کا تحریک خلافت کے سلسلے میں گرفتار ہو جانا گویا غیرت ملی کو ایک کھلا چیلنج تھا۔ جسے مسلمانوں نے بخوشی قبول کیا۔

اب جمعیت خلافت مرکزیہ کی ہدایت سے ہندوستان کے طول و عرض میں تحریک عدم تعاون کو ہمہ گیر شکل اختیار کرتے دیکھا۔ اور صوبہ سرحد میں ایسی گرمی پیدا ہوئی۔ کہ شاید ہی کسی دوسرے علاقے میں اس کی مثال مل سکے۔ صرف خطاب یافتگان کا ایک طبقہ ایسا تھا جو زیادہ متاثر نہ ہوا۔ ورنہ عام حالت یہ تھی کہ وکلاء نے وکالتیں ترک کر دیں۔ مجسٹریٹ ہاتھ پر ہاتھ دھرے نظر آئے۔ حکومت کے کاروبار میں

رکاوٹیں پیدا ہوگئیں۔ چنانچہ اس قسم کی رکاوٹوں کا ذکر کرتے ہوئے جنرل سر جارج میکمن (Gen. Sir Mc. Munn) لکھتا ہے کہ :۔

"مقبوضہ اضلاع میں بھی اس خطرناک دور میں ہجرت اور خلافت کی تحریکوں نے عدم اعتماد پیدا کر رکھا تھا۔ اور پشاور سے اس کا اثر جنوبی علاقے میں بھی پھیل گیا۔"

ایک دوسرے انگریز مسٹر ایورٹ (EWART) نے لکھا کہ :۔

"صوبے کے طول و عرض میں خصوصاً بنوں میں تو اس تحریک نے خلاف ورزیٔ قانون کی ایسی ہی شکل اختیار کر لی کہ جیسی پشاور میں اول جنگ افغانستان کے وقت ۱۹۱۹ء میں اور دوبارہ ولیعہد حکومت برطانیہ کی آمد کے وقت ظاہر ہوئی تھیں ۔۔۔"

اور پھر یہی مصنف آگے چل کر لکھتا ہے کہ :۔

"ہزارہ میں مولوی محمد اسحٰق نے تو "شاہی عدالت" کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ اسی طرح ! ہزارہ کی تحصیل مانسہرہ نے عملاً حکومت برطانیہ کے وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور دیہاتیوں نے خصوصاً ڈھوڈیال اور شنکیاری میں تو اپنے تھانیدار اور تحصیلدار وغیرہ تک مقرر کر لئے تھے۔ انہوں نے خود حکومت کا کاروبار چلانا شروع کر دیا۔ اور دو تین مواقع پر سرکاری افسروں کو جو اپنے فرائض سرانجام دے رہے تھے بے عزت بھی کیا تھا۔ . . . . اس طرح پشاور کوہاٹ اور بنوں میں خطرات نظر آنے لگے تھے"

جب حکومت کو ہندوستان میں تحریک عدم تعاون کی ہمہ گیر صورت کے نتائج سے فکر دامنگیر ہوئی۔ تو باشندگان وطن کی دل جوئی کا سامان پیدا کرنے کے لئے

ایک وفد کو انگلستان مدعو کیا گیا۔ تاکہ مسئلہ خلافت پر اس سے گفتگو ہو سکے۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری ان دنوں سیٹھ حاجی جان محمد چھوٹانی صدر جمعیت خلافت کے ساتھ اس وفد کے رکن تھے۔ کہ ہندوستان میں تحریک عدم تعاون جس شدت وسرعت سے پھیلی تھی۔ اس کا اندازہ ڈاکٹر انصاری کے اس مضمون سے ہوتا ہے جو لندن کے رسالہ "وینچر" (Venture) کے ماہ مئی سنہ ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا تھا۔ جس میں مرقوم تھا کہ پچیس سے چھبیس ہزار تک گورنمنٹ کے خطابات واپس کئے گئے تھے۔ اور جنوری سنہ ۱۹۲۱ء سے اس بیان کی اشاعت تک ولایتی کپڑے کی درآمد کیلئے کوئی آرڈر نہ دیا گیا تھا۔

جب مولنا محمد علی جوہر اپنے وفد کے ہمراہ انگلستان سے واپس وطن لوٹے۔ تو "تحریک ہجرت" خود بخود ختم ہو گئی تھی۔ اب اس کے متعلق کسی قسم کی فکر کی ضرورت نہ تھی البتہ تحریک نے ایک نیا ولولہ اور جذبہ ایثار پیدا کر دیا۔ اور انہی حالات کے باعث اسلامیان ہند جدوجہد آزادی کیلئے نہایت جوش وخروش سے مصروف عمل نظر آتے تھے۔

نوٹ حاشیہ صفحہ ۱۶۴

لے مولنا فضل ربی کے آباؤ اجداد موضع بٹہ موہری علاقہ نندھاڑ کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد مولوی محمود صاحب بفہ میں سکونت پذیر ہوئے۔ آپ دیوبند کے تعلیم یافتہ تھے۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں فارغ التحصیل ہوئے۔ سنہ ۱۹۱۴ء کی عالمی جنگ میں علمائے ہند محمود الحسن شیخ الہند اور مولنا عبید اللہ سندھی کے مشن کیمطابق انگریزی حکومت کے خلاف جلسے اور تقریریں کرتے رہے ہیں۔ جب ان کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوئے۔ تو آپ مجاہدین چمرقند کے پاس چلے گئے اور آزاد

قبائل کے لشکروں میں شامل ہو کر انگریزی فوج پر یلغار کرتے رہے۔ ۱۹۲۹ء میں امان اللہ خان کی جنگ آزادی کے وقت نادر خان کی فوج میں شامل تھے۔ امان اللہ خان کو افغانستان کا بادشاہ باقاعدہ تسلیم کئے جانے پر آپ وہاں مفتی مقرر تھے مولنا فضل ربی کے مجاہدین چمرقند کے ساتھ شامل ہونے پر ان کے چھوٹے بھائی فضل الٰہی اور ان کے قریبی رشتہ دار مولنا گل حسن کو گرفتار کر لیا گیا۔ آخر الذکر تو ایک سال کے بعد رہا ہو گئے لیکن فضل الٰہی کو طویل مدت جیل میں گزارنی پڑی۔ پاکستان بن جانے کے بعد اگرچہ مولنا فضل ربی کے داخلہ پر سے پابندی ہٹالی گئی۔ لیکن وہ واپس نہ آئے۔ چند سال بعد ہی کابل میں رحلت فرمائی۔ ان کی اولاد امان اللہ خان کی دی ہوئی جاگیر سے مستفید ہو رہی ہے۔ ان کے چھوٹے بھائی فضل الٰہی زندہ ہیں اور اپنے گاؤں بٹہ موہری سندھاڑ میں ہیں۔

اسی علاقہ سندھاڑ کے موضع شکری میں عربی زبان و ادبیات کے فاضل مولنا محمد رسول خان پیدا ہوئے جنہوں نے ابتدائی تعلیم و تربیت علاقہ سندھاڑ میں کی تحریک خلافت کے زمانہ میں حضرت مولنا محمد رسول صاحب دارالعلوم دیوبند پہنچے تکمیل علوم کے بعد وہیں مدرس ہو گئے ۲۹ر فروری ۱۹۲۵ء کو ان کا تقرر اورینٹل کالج لاہور میں بحیثیت پروفیسر ہوا۔ بیس سال بعد ستمبر ۱۹۵۴ء میں اس ملازمت سے سبکدوش ہوئے اس کے بعد جامعہ اشرفیہ لاہور میں شیخ التفسیر رہے۔ آپ حضرت مولنا مفتی محمد حسنؒ کی خواہش پر جامعہ اشرفیہ لاہور تشریف لائے تھے آپ کا شمار برصغیر ہندو پاک کے ممتاز علماء میں ہوتا تھا۔ ۲۵ر اکتوبر ۱۹۷۱ء کو حضرت مولنا محمد رسول خان فوت ہوئے اور دوسرے روز ۲۶ر اکتوبر ۱۹۷۱ء کو بمقام اچھڑیاں تحصیل مانسہرہ اپنے آبائی گاؤں میں دفن ہوئے۔ مولنا مرحوم، مولنا مفتی محمود صاحب کے استاد تھے۔

اسی علاقہ سندھاڑ کے ایک اور جید عالم مولنا عبدالغفور تھے جو مدینہ منورہ میں درس قرآن و حدیث دیا کرتے تھے۔ اسی نسبت سے مولنا عبدالغفور مدنی کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں

جو کہ طویل عرصہ اہل زبان کو درس قرآن و حدیث دیتے رہے۔ مولانا موصوف چند برس قبل فوت ہو چکے ہیں۔ مدینۃ النبیؐ میں مدفون ہوئے۔ آج کل بھی کسی کا شمالی افریقہ سے گزر ہو تو وہاں آپ کو مولانا محمد شاہ سکونتی ڈھینڈہ تحصیل ہری پور (ہزارہ) کے نقوش نظر آئیں گے۔ جنہوں نے گذشتہ صدی میں عمر کا بیشتر حصہ شمالی افریقہ میں تبلیغ اسلام کیلئے گزارا۔ اور خود سرزمین حجاز (مدینہ منورہ) میں محو خواب ہیں۔ اور گذشتہ صدی میں ہی جنوبی افریقہ میں مولانا محمد حسین سکونتی ملک پورہ ایبٹ آباد (ہزارہ) کے اثرات ملیں گے۔ اور نیروبی میں ان کا مزار ہے۔ درحقیقت علمائے ہزارہ نے دیوبند کی عظیم الشان دینی درسگاہ کی مسند نشینی تک رسائی حاصل کی ہے حریت و آزادی کو ایک عالم میں فروزاں کیا۔ اور ہر باطل قوت سے ٹکرانے کیلئے علمائے ہزارہ نے دست خود میں سیف و سنان سنبھالا۔ دارالعلوم دیوبند کے شاف کے ممبر حضرت مولانا غلام رسول صاحب آپ بفہ BAFFA ضلع ہزارہ کے رہنے والے تھے منطق اور علم الکلام پر پورا پورا عبور رکھتا۔ اور وہاں ان علوم کا درس دیتے تھے تصوّف میں بھی آپ خاص حیثیت کے مالک تھے آپ شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ صاحب کی اسیری مالٹا کے ایام میں وفات پا گئے حضرت شیخ الہندؒ نے ان کی وفات پر مرثیہ لکھا جو" کلیات شیخ الہند" میں شائع ہو چکا ہے اس سے آپ کے حضرت شیخ الہندؒ سے تعلق اور ان کے ہاں آپ کے مرتبہ کا پتہ چلتا ہے — مولانا غلام رسول صاحب شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کے بھی استاد ہیں۔ آپ کا مزار دیوبند میں ہے۔

مزید برآں یہ وضاحت بھی ضروری ہے۔ بقول ڈاکٹر شیر بہادر خان پنیؔ مصنف" تاریخ ہزارہ" کہ" حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی کے استاد قاضی محمود صاحب مانگل تحصیل ایبٹ آباد (ہزارہ) والے تھے"۔ جدوجہد آزادی میں علمائے ہزارہ نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ حضرت مولانا ابو المعارف محمد عرفان کی فصاحت و بلاغت اور صحافت کا عالم اسلام معترف ہے اور ادبی و علمی لحاظ سے بھی مولانا حمید الدین مانسہروی۔ میر ولی اللہ ایڈووکیٹ ایبٹ آباد اور مولانا

عبد العزیز ہزاروی مرحوم (امیر جماعت اسلامی صوبہ بلوچستان) کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس امر سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ دورِ حاضرہ میں مولنا عبد الحق بغوی (ہزاروی) بحرین عرب میں مولنا رحمت اللہ سکونتی عنایت آباد پکھلی ہزارہ مکہ میں اور مولنا شمس الدین سکونتی سکندرپور ہری پور (ہزارہ) آسٹریلیا میں شمع اسلام فروزاں کئے ہوئے نظر آتے ہیں۔

---

۱۲ ـ محمد اکبر قریشی۔ ہری پور کا قریشی خاندان عوام میں خاندان رسالدار یاں کے نام سے مشہور ہے ان کے آباؤ اجداد بدخشاں سے ستھانہ اور پھر وہاں سے ہری پور میں سکونت پذیر ہوئے محمد اکبر خان قریشی اس نامور خاندان کے فرد ہیں۔ آپ اسلامیہ کالج پشاور کے بی۔ اے ہیں۔ اور زندگی سرفروشانہ گذاری تحریک ہجرت میں آپ اسلامیہ کالج کے طالب علم تھے۔ یہ تحریک ترکوں کے ساتھ ظالمانہ صلح مورخہ ۱۴ مارچ سنہ ۱۹۲۰ء جس کے کرتا دھرتا مسٹر لائیڈ جارج وزیر اعظم انگلستان تھے کی رو سے ترکی کے حصے بخرے کرنے پر مسلمانان عالم کی برانگیختگی کا مظہر تھی۔ اسی تحریک کے زیر اثر لالہ محمد اکبر خان پانچ ہمراہیوں سمیت اسلامیہ کالج پشاور سے پیدل چل کر افغانستان روانہ ہوئے اور حاجی صاحب ترنگزئی (مقیم علاقہ مہمند) کے ہاں پہنچے۔ حاجی صاحب سنہ ۱۹۱۶ء میں (دوران جنگ سنہ ۱۸-۱۹۱۴ء) اعلان جہاد کر کے ہجرت کر گئے۔ وہاں ان کی ملاقات مجاہد سرحد قاضی عبد الولی صاحب ساکن پشاور سے ہوئی۔ سنہ ۱۹-۱۹۱۸ء کی سیاسی تحریک کے دوران گرفتاری سے بچ کر یاغستان چلے گئے تھے۔ قاضی صاحب حکومت افغانستان کی مجلس مشاورت کے رکن رہے۔ آپ انگریزی پشتو اردو اور ترکی میں مادری زبان کی طرح گفتگو کر سکتے تھے۔ لالہ محمد اکبر خان یاغستان سے افغانستان اور پھر روس چلے گئے کم و بیش دس سال وہاں گزارنے کے بعد جب واپس آئے۔ تو حکومت انگریزی نے ان کو گرفتار کر لیا اور تقریباً آٹھ دس سال جیل میں گزارے۔ آج کل زمینداری خاص کر باغبانی کا شغل کرتے ہیں۔

برسبیل تذکرہ علمائے ہزارہ کے ضمن میں ایک جیّد عالم دین کو فراموش نہیں کیا جا سکتا جن کا شمار برصغیر ہند و پاک کی مقتدر شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ برصغیر کے علمی و دینی حلقے ان کی شخصیت کے معترف ہیں۔ وہ ہیں مولانا محمد یعقوب محدث دہلوی بن مولانا محمد عبداللہ (سکونتی گنڈہ نزد مانسہرہ) علم و عمل کا جامع۔ اخلاص و شرافت کا پیکر، ممتاز ادیب اور خطیب بے بدل ہیں۔ ان کی قلم کا شاہکار "وہابی مذہب" انتہائی فکر انگیز تصنیف ہے۔ اور کئی مسودے راقم الحروف کی نظر سے گزرے ہیں۔ زندگی کا بیشتر حصہ علمی مشاغل میں گذار دیا ہے۔ آج کل گورنمنٹ ہائی سکول مانسہرہ میں ٹیچر کے فرائض سر انجام دے رہے ہیں اور طارق محمود، ذکی محمود صاحب موصوف کے فرزند ہیں۔ اول الذکر طارق محمود نے راقم الحروف کے متعلق لاتعداد اشعار لکھے ہیں۔ جو کسی وقت منظر عام پر آسکتے ہیں

تحریک ناموس رسالت

تحریک خلافت میں ناکامی کے بعد مسلمان مایوسی کی انتہا تک پہنچ گئے۔ اپنوں کی غداری اور اغیار کی سازشوں نے ایک ایسے دوراہے پر پہنچا دیا تھا جہاں حقیقت کو یاس و افسردگی کی بھیانک چادر نے نگل لیا تھا اور تحریک خلافت کی سلگتی ہوئی چنگاری سے تحریک ہجرت شروع ہوئی۔ لاکھوں افراد اس جذباتی تحریک کی رو میں بہہ کر ہجرت کر کے کابل چلے گئے۔ وہاں خاطر خواہ انتظام نہ ہو سکا۔ یکے بعد دیگرے ہندوستان واپس آگئے ادھر تحریک خلافت کے ہنگامے سرد ہو چکے تھے۔ اور ہندو ذہن پر آشکارا ہو رہا تھا۔ کہ کانگرس کی چھری مسلمانوں کو خاموش کرنے کیلئے حرکت میں آچکی تھی۔ اور متعصب ہندوؤں نے شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں شروع کر دیں جن کا مقصد یہ تھا کہ ہندو متحد ہو کر انگریز کے خلاف جنگ کرنے کی کوشش نہ کریں۔ بلکہ مسلمانوں کی طرف رجوع کر کے انہیں ہندو بنائیں۔ ان کی ریشہ دوانیوں کے باعث ہندوؤں اور مسلمانوں میں شدید اختلافات کی صورت اختیار کر گئے۔ برصغیر میں ہندو مسلم کشیدگی انتہا تک پہنچ گئی۔ فرقہ پرست ہندوؤں نے اختلافات کو اور ہوا دی۔ اور مسلمانوں کی دل آزاری کیلئے ایک ہندو ناشر نے "رنگیلا رسول" نامی کتاب شائع کی۔ جس میں حضور سرور کائنات فخر موجودات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدس پر نہایت رکیک حملے کئے تھے۔ مسلمانان ہند کی غیرت بھڑک اٹھی۔ اور انہوں نے بیک لخت احتجاج کیا۔ تو راجپال پر مقدمہ چلایا گیا۔ اسے چھ ماہ کی سزا دی گئی۔ ان دنوں سر شادی لال پنجاب ہائی کورٹ کا چیف جسٹس تھا۔ جب راجپال نے سزا کے خلاف اپیل دائر کی تو چیف جسٹس نے بری کر دیا۔ اس کے ردعمل کے طور مسلمانوں نے جلسے کئے۔ جلوس نکالے۔ ہر سو اطراف غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ مسلمانوں کے جوش و خروش کا یہ عالم

تھا کہ عبدالعزیز غزنوی نامی کوہاٹ کا ایک نوجوان لاہور آیا۔ راجپال کی دکان پر اس کی بجائے ایک اور ہندو بیٹھا تھا۔ اس نے اس پر حملہ کر دیا۔ نتیجہ کے طور اسے چودہ سال کی سزا بھگتنی پڑی۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد لاہور کے ایک شیر فروش خدا بخش "اکو جیہا" نے راجپال پر حملہ کر دیا۔ وار اوچھا پڑا۔ راجپال بچ گیا۔ مگر اکو جیہا کو بھی سات سال کی سزا دی گئی۔ ان وارداتوں نے غازی علم الدین کو بےحد متاثر کیا کہ میرے دو بھائی دشمنِ رسول صلعم کو جہنم واصل کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ کیوں نہ میں یہ سعادت حاصل کروں۔ چنانچہ وہ چھ اپریل ۱۹۲۹ء کو اللہ کا نام لیکر راجپال کی دکان پر چلے گئے۔ تو راجپال دکان پر موجود تھا۔ علم الدین نے دکان میں داخل ہو کر چھری کے ایک ہی وار سے اسے ختم کر دیا۔ علم الدین کو گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ دس اپریل کو آپ کو سیشن سپرد کر دیا۔ ۲۲ مئی ۱۹۲۹ء کو انہیں سزائے موت کا حکم سنایا گیا۔ ہائی کورٹ میں اپیل دائر کی گئی۔ قائداعظم محمد علی جناح نے ان کی پیروی کی۔ مگر سزائے موت بحال رہی۔ آخر ۳۱ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو عاشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو میانوالی جیل میں پھانسی دی گئی۔

غلامانِ محمد کی پرانی رسم ہے
کودتے ہیں آگ میں اکثر چڑھے ہیں دار پر

لاہور کے مسلمانوں پر قیامت بیت گئی۔ جلسے ہوئے۔ جلوس نکلے اور شہید کی لاش کا مطالبہ کیا۔ مسلم قائدین نے صوبائی گورنر پر زور دیا کہ لاش مسلمانوں کے حوالے کر دی جائے۔ چنانچہ عوامی تحریک کے باعث گورنر نے مسلمانوں کا مطالبہ مانتے ہوئے لاش کی حوالگی کا حکم دے دیا۔ لاکھوں مسلمانوں نے شہید کی نماز جنازہ پڑھی انہیں لاہور میں میانی صاحب کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

غازی علم الدین کوچہ سبک سواراں میں رہائش پذیر تھے۔ اور بڑھئی کا کام کرتے تھے اس باعث انہیں غازی علم الدین لاہوری کے نام سے منسوب کیا ہے۔ بعض مورخین

کی رائے ہے کہ وہ کوہاٹ میں پیدا ہوئے صرف بسلسلۂ روزگار لاہور (LAHORE) میں مقیم تھے ضلع کوہاٹ کی معروف شخصیت ممتاز عالم دین ڈاکٹر محمد سلیم صاحب جو کہ سدہ (SADDA) کرم ایجنسی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور آج کل تحصیل ہنگو کے مشہور شہر ٹل (TAL) میں ہومیو پیتھک ڈاکٹر ہیں۔ انہوں نے مجھے دوران گفتگو بتایا کہ

"غازی علم الدین ضلع ہزارہ میں پیدا ہوئے اور کوہاٹ (KOHAT) میں کافی عرصہ رہے ۱۹۲۸ء کو تلاش روزگار کے لئے لاہور چلے گئے۔"

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ فی الواقع ضلع ہزارہ کے تھے۔ اور نہ ہی ان کی جائے پیدائش کے متعلق حتمی رائے قائم کی جا سکتی ہے بعض مؤرخین نے فرطِ عقیدت سے انہیں لاہوری ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ صرف اس وجہ سے کہ وہ زندگی کے آخری ایام کوچہ سبک سواراں لاہور میں بیت رہے تھے

محترم ابوالفضل صدیقی سے روایت ہے:۔

"اسیں گلاں ای کردے رہے تے ترکھاناں دا منڈا بازی لے گیا ــــ"

یہ ہے "مصوّرِ پاکستان" علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کا خراجِ تحسین ضرب حیدری اور رسم شبّیری تازہ کرنے والے عاشق جانبازہ غازی علم الدین شہید کی خدمت میں

ایسے ہی تاثرات کا اظہار انہوں نے غازی عبدالقیوم شہید کے بارے میں کیا تھا جب مسلمانوں کے ایک وفد نے حضرت علامہ اقبال کی توجہ اس جانب مبذول کرائی کہ غازی عبدالقیوم شہید کی سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کرانے میں وائسرائے ہند سے سفارش کیجئے، چند ثانیے سوچنے کے بعد آپ نے پوچھا:۔

"کیوں؟ کیا عبدالقیوم کمزور پڑ گیا ہے؟"

جواب ملا۔ "نہیں!"

پھر آپ نے تفسیر خودی ان الفاظ میں بیان فرمائی:۔ ۵

نظر اللہ پہ رکھتا ہے مسلمان غیور
موت کیا شے ہے؟ فقط عالم معنی کا سفر
ان شہیدوں کی دیت اہلِ کلیسا سے نہ مانگ
قدر و قیمت میں ہے خوں جن کا حرم سے بڑھ کر
آہ! اے مردِ مسلماں تجھے کیا یاد نہیں
حرفِ لَا تَدْعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـھًا آخَر

ناموسِ مصطفےٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ پروانہ ضلع ہزارہ کے مشہور شہر "غازی" کا رہنے والا تھا۔ نہایت غریب والدین کا بیٹا تھا۔ جب تلاش معاش میں کراچی پہنچا۔ یہاں گھوڑا گاڑی چلانے پر نوکر ہو گیا۔ مذہب سے لگاؤ اس کی گھٹی میں پڑا تھا۔ وہ صرف ناظرہ قرآن پڑھا ہوا تھا۔ خدا اور رسول کے علاوہ کچھ نہ جانتا تھا۔ بدر و حنین کے واقعات سنے ہوئے تھے اور حسین و علی رضی اللہ عنہم کی روح کا پرتو تو اس کے خون میں رچا ہوا تھا۔ یہ وفا کا پتلا بحرِ عشق کا شناور اور عمل کے میدان کا غازی تھا۔ شمعِ رسالت کا یہ پروانہ ایک بوڑھے چچا، ایک ضعیفہ ماں اور ایک بیوہ بہن کی روزی کا کفیل اور ان کے علاوہ ایک نئی نویلی دلہن کی آرزوؤں اور تمناؤں کا امین تھا وقوعہ سے ہفتہ عشرہ قبل ہی اس کی شادی ہوئی تھی۔ اس کی مالی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اور کراچی میں بھی نہ سدھری۔ صبح اور شام کا آٹا پرچون کی دکان سے آتا تھا اس کے باوجود دل درد کی دولت سے مالا مال تھا۔ رسائی پشت پناہی اپنی جھونپڑی کے قریب والی مسجد کے امام تک تھی۔ جہاں وہ فجر اور عشاء کی نماز پڑھا کرتا تھا خود اخبار پڑھنے کی استعداد نہ تھی۔ پیش امام کی زبانی ہی نتھورام کی خرافات کا ذکر اس نے سنا۔ اس کی غیرتِ ایمانی بھڑک اٹھی۔ اس نے وہیں مسجد کے صحن میں اپنے خدا کو حاضر و ناظر جان کر عہد کیا کہ وہ اس گستاخ نابکار کو واصل جہنم کر کے

رہے گا۔ اور آوارہ و بے خانماں ایک ہی جست میں عرفان و عمل کی آخری منزل طے کر گیا۔ کراچی کا یہ گمنام مزدور اس مقام پر پہنچ گیا جس کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے ملک الموت کے پَر بھی جلتے ہیں۔

اس مرد مجاہد اور عاشق رسول صلعم کی داستان شجاعت سید محمد اسلم ایم۔ اے (آکسن) بار ایٹ لا سے روایت ہے۔ جنہوں نے غازی کے پاک عمل کی حمایت اپنے زورِ قلم اور زورِ بیان سے کی اور مقدمہ لڑا۔ ان کے دولت کدے پر دیوار پر ایک پرانی سی تصویر آویزاں ہے جس کے نیچے یہ شعر درج ہے۔

من از سر تو جلوہ دہم دار و رسن را
عمریست کہ آوازۂ منصور کہن شد

بقول بیرسٹر صاحب موصوف روداد ذیل ہے۔

"یہ ان دنوں کی بات ہے جب شردھانند کی شدھی تحریک زوروں پر تھی اور بد زبان اور گستاخ ہندو ذات رسالت مآبؐ پر رکیک حملے کر رہے تھے ۱۹۳۳ء کے اوائل میں آریہ سماج حیدر آباد (سندھ) کے سیکرٹری نتھورام نے ایک کتاب بعنوان "ہسٹری آف اسلام" شائع کیا۔ یہ پمفلٹ "رنگیلا رسول" اور اس جیسی دیگر کتابوں سے ماخذ مواد پر مشتمل تھا۔ اور اس میں ناموس رسالتؐ پر اسی انداز میں حملے کئے گئے۔ جیسا کہ گذشتہ گیارہ سال سے آریہ سماجی کر رہے تھے اس وقت سندھ صوبہ بمبئی میں شامل تھا۔ گو صوبہ بمبئی ہندو اکثریت کا صوبہ تھا لیکن سندھ کے تمام اضلاع میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ مسلمان اکثریت میں ہونے کے باوجود ملازمت، تجارت، تعلیم اور اقتصادی شعبوں میں ہندوؤں سے پیچھے تھے۔ تاہم وہ اپنے مذہب پر کسی حملے کو برداشت کرنے کے روادار نہ تھے۔ چنانچہ جونہی نتھورام کا ناپاک کتابچہ بازار میں آیا عبدالمجید سندھی، حاتم علوی اور دوسرے مسلمان لیڈر اٹھ کھڑے ہوئے۔ نتھورام کے خلاف استغاثہ دائر کیا۔ حیدر آباد

کی عدالت نے کتابچہ ضبط کر لیا۔ اور ملزم کو ایک سال قید سخت اور جرمانے کی سزا دی۔
یعنی وہ کھیل کھیلا گیا۔ جو راج پال (RAJPAL) کے مقدمے میں مسلمانوں نے دیکھا تھا۔
نتھو رام نے عدالت (ان دنوں جوڈیشل کمشنری کہلاتی تھی) میں اپیل دائر کر دی۔ ضمانت پر
وہ پہلے ہی رہا ہو چکا تھا۔ مارچ ۱۹۳۴ء میں اپیل کی سماعت شروع ہوئی۔ ہندو اور
مسلمان بھاری تعداد میں کارروائی سننے آئے۔ جن میں میں بھی شامل تھا۔ نتھو رام اپنے
ساتھیوں کے ہمراہ خوش گپیاں کرتا ہوا آیا۔ اور عدالت میں ڈائس کے قریب پڑے
ہوئے بنچ پر بیٹھ گیا تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ایک مسلم نوجوان عدالت کے کمرے میں
داخل ہوا۔ معذرت کرتے ہوئے نتھو رام کو تھوڑا سا سرکایا اور پھر اس کے قریب بیٹھ گیا
پونے بارہ بجے کا عمل تھا۔ اور پندرہ منٹ بعد نتھو رام کی اپیل کی سماعت شروع ہونیوالی
تھی۔ میں پہنچا تو بارہ بجنے میں چھ سات منٹ باقی تھے۔ عدالت کے برآمدے میں ایک دوست
سے باتیں کرنے لگا۔ اچانک عدالت کے کمرے سے تیز تیز آوازیں آنے لگیں۔ جیسے کوئی
نعرے لگا رہا ہو۔ ساتھ ہی بہت سے آدمی باہر کو بھاگے۔ میں لپک کر کمرے میں داخل ہوا
تو دیکھا۔ نتھو رام کی آنتیں نکلی پڑی ہیں۔ اور وہ زمین پر پڑا موت و حیات کی کشمکش
میں مبتلا ہے۔ اس کی گدی سے خون کا فوارہ اُبل رہا ہے۔ قریب ہی ایک مسلمان
نوجوان ہاتھ میں ایک بڑا سا خون آلود خنجر لئے کھڑا نظر آرہا ہے۔ دو انگریز ججوں میں
سے ایک جس کا نام او سالون (O-SOLVIN) تھا۔ ڈائس سے اترا۔ مسلم نوجوان پر قہر
آلود نگاہ ڈالی۔ اور تحکمانہ انداز میں بولا۔ "تو نے اس کو مار ڈالا؟" "ہاں! اور کیا کرتا؟"
نوجوان نے بڑی بیباکی سے جواب دیا۔ اور پھر کمرے میں آویزاں جارج پنجم کی تصویر
کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اگر یہ تمہارے اس بادشاہ کو گالیاں دیتا تو تم کیا
کرتے؟ تم میں غیرت ہوتی تو کیا تم قتل نہ کر ڈالتے؟" پھر انتہائی حقارت سے نتھو رام
کی لاش کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے بولا۔ "اس خنزیر کے بچے نے میرے

آقا اور شہنشاہوں کے شہنشاہ کی شان میں گستاخی کی تھی اور اس کی یہی سزا تھی" پھر بڑے اطمینان کے ساتھ اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

اسی اثنا میں ایک سب انسپکٹر ریوالور تانے کمرۂ عدالت میں داخل ہوا۔ انھیں چار ہوتے ہی غازی نے چھری پھینک دی۔ کھڑا ہو گیا اور بڑی جوشیلی آواز میں کہا۔ "ڈریئے نہیں ریوالور ہولسٹر میں رکھ لیں۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا۔ الحمدللہ! کر چکا ہوں" سب انسپکٹر نے ریوالور والا ہاتھ پیچھے کر لیا۔ آگے بڑھ کر غازی کی کلائی پکڑ لی۔ ساتھ والے کانسٹیبل نے فوراً ہتھکڑی پہنا دی۔ میرا دل جو نتھو رام کی گندی کتاب سے مجروح ہو چکا تھا۔ اس منظر کو دیکھ کر باغ باغ ہو گیا۔ غازی نے اپنا فرض ادا کر دیا تھا۔ میں نے اپنا فرض ادا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

میں نے غازی کے چچا کو تلاش کیا۔ اور انہیں پیشکش کی کہ میں اس مقدمے کی پیروی مفت کرونگا۔ انہوں نے تشکر آمیز الفاظ کے ساتھ میری پیشکش قبول کر لی۔ دوسرے روز میں غازی کے قانونی مشیر کی حیثیت سے ان سے ملاقات کرنے جیل گیا۔

اس سے پہلے بھی میں نے جیل میں قتل کے ملزموں سے ضابطے کی ملاقاتیں کی تھیں۔ اور ان کی صورتیں مجھے یاد ہیں۔ مگر جو اطمینان اور سکون غازی عبدالقیوم کے بشرے سے ہویدا تھا۔ وہ کسی اور چہرے پر نظر نہ آیا۔ جب میں نے بتایا کہ میں آپ کا مقدمہ لڑوں گا۔ تو وہ مرد مجاہد پکار اٹھا۔ "آپ جو چاہیں کریں مگر مجھ سے انکار قتل نہ کرائیں۔ اس سے میرے جذبہ جہاد کو ٹھیس پہنچے گی۔" میں نے نوجوان غازی کو تشفی دی اور کہا۔ "بیشک آپ اقرار کریں۔ اور میں اس اقبال کے ذریعے انشاء اللہ آپ کو پھانسی سے اتار لوں گا۔" مگر میری اس تشفی پر انہوں نے خوشی کا اظہار نہ کیا۔ میں نے دو چار باتیں اور کیں اور ایک کاغذ پر دستخط کرا کے لوٹ آیا۔

ہندو پیرو کاری کی بوالعجبی ملاحظہ ہو۔ کہ اینگلو انڈین قانون کا ضابطہ اپنی مخصوص

اور روایتی چال کی بجائے اتنی تیزی سے حرکت میں آیا۔ کہ مہینوں کا کام گھنٹوں میں طے ہونے لگا۔ پہلی رپورٹ کے بعد تفتیش چالان وغیرہ سب کچھ دو دن میں ہو گیا اور مقدمہ قتل عمد سماعت کیلئے ابتدائی عدالت میں پہنچ گیا جب میں نے گواہان صفائی کی فہرست پیش کی تو اسے پڑھ کر مجسٹریٹ بہادر چونک اٹھے ہیں نے دوسرے گواہوں کے علاوہ مولانا ظفر علی خان، خواجہ حسن نظامی، علامہ اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شوکت علی اور مفتی کفایت اللہ کے علاوہ دیوبند اور فرنگی محل کے متعدد مقتدر علماء کو طلب کیا۔ عدالت نے اعتراض کیا کہ یہ گواہ مقدمہ سے غیر متعلق (IRRELEVANT) ہیں۔ اس لئے نہیں بلائے جاسکتے۔ میں نے جواب دیا۔ کہ جس جذبے کے تحت استغاثہ مجھ کو قاتل قرار دیتا ہے۔ اس جذبے کی نفسیاتی ترجمانی یہی حضرات کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے میری یہ دلیل جج کے فہم سے بالاتر تھی۔ چنانچہ اس نے میری درخواست خارج کر دی۔ میں نے فوراً جوڈیشل کمشنری کراچی میں اپیل دائر کر دی جس کے دو جج اوساون اور فیرس دونوں عوقعے کے چشم دید گواہ تھے۔ اپیل دائر کرنے کے ساتھ ساتھ میں نے ان ججوں کے اختیار سماعت پر قانونی اعتراض کر دیا۔ کراچی جوڈیشل میں اس وقت چار جج تھے دو چھوٹے اور دو بڑے۔ ان میں سے تین اس درخواست کی سماعت کے اہل نہ تھے۔ چنانچہ عدالت عالیہ کے ججوں نے ایک جج مسٹر لوبو (LOBO) کو طلب کر کے بنچ ترتیب دے دیا۔ اپیل کی سماعت ہوئی۔ اور بنچ نے بھی یہی فیصلہ دیا۔ کہ ان غیر متعلق گواہوں کو بلانے کی کوئی گنجائش نہیں۔ گویا اپیل خارج ہو گئی۔ دو تین روز بعد مقدمہ سیشن جج کراچی کی عدالت میں آ گیا۔ مقدمے کی اہمیت کے پیش نظر عدالت نے اسے "جیوری ٹرائل" قرار دیا۔ جیوری نو افراد پر مشتمل تھی۔ جن میں چھ انگریز، ایک پارسی اور دو عیسائی تھے۔ یہ سب کے سب اچھی شہرت، معقول سوجھ بوجھ کے مالک اور باعزت شہری تھے۔

قتل کے عام مقدموں کے برعکس اس مقدمے کا کام بہت مختصر اور سیدھا سادہ تھا۔ صفائی کا تو گواہ تھا ہی نہیں۔ سارا دار و مدار قانونی بحث پر تھا۔ ثبوت میں اول تو خود

عدالت عالیہ کے دو انگریز جج تھے۔ دوسرے غازی عبدالقیوم نے اپنے اقبالی بیان میں تسلیم کر لیا تھا کہ "میں نے جونا مارکیٹ کی مسجد میں پیش امام کی زبانی نتھورام کے فحش پمفلٹ کے مندرجات سنے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ کل اس کی اپیل کی سماعت کیلئے عدالت میں پیشی ہو رہی ہے۔ چنانچہ اگلے روز میں نے اپنا کاروبار چھوڑا اور بازار سے ایک بڑا خنجر خریدا۔ اسے تیز کرایا اور سماعت سے پہلے ہی عدالت میں پہنچ گیا۔ ایک نامعلوم شخص کے ذریعے نتھورام کو شناخت کیا۔ اور پھر اس کے قریب ہی جا بیٹھا۔ میں نے اسے کنکھیوں سے دیکھا، یکایک میرے سینے میں غیظ و غضب کا طوفان امڈ آیا۔ میں آپے سے باہر ہو کر اپنی نشست سے اٹھا۔ شلوار کے نیفے میں چھپایا ہوا خنجر نکالا اور چشم زدن میں نتھورام کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ اس کی آنتیں نکل آئیں اور وہ منہ کے بل گر پڑا۔ دوسرا وار اس کی گدی پر کیا یہ ضرب پہلی سے زیادہ کاری ثابت ہوئی۔ خون کا فوارہ چھوٹ نکلا اور چند ہی سیکنڈ میں اس کا قصہ تمام ہو گیا۔" اس اقبالی بیان کی تائید میں ضابطے کے بیانات ہوئے استغاثے کے چشم دید گواہ (عدالت عالیہ کے دو جج) پیش ہوئے جہاں تک اتفاقی پہلو کا تعلق تھا، بچاؤ کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ بس جذبے اور ارادے والی بات رہ جاتی تھی۔ مگر غازی موصوف کے اقبالی بیان سے صاف ظاہر تھا کہ اس نے یہ اقدام ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچ کر کیا تھا۔ اس میں فوری اشتعال اور فوری عمل کا کوئی ہاتھ نہ تھا۔ تاہم میں نے کیس کو تقریباً ان ہی خطوط پر تیار کیا۔ اور قانون سے زیادہ نفسیات انسانی اور تاریخ سے بحث کی۔ جیوری اور جج کے سامنے میں نے جو بحث کی، وہ شاید برطانوی عہد میں اپنی نوعیت کی واحد اور منفرد بحث تھی۔

جس روز بحث ہونا تھی، میں نے قانونی پلندوں کی بجائے قرآن عزیز کا ایک نسخہ لے کر عدالت میں پیش ہوا۔ جج اور جیوری میرے ہاتھ میں قرآن پاک کو دیکھ کر متحیر رہ گئے۔ عام وکلاء سے ذرا پیچھے ہٹ کر میں نے بلند آواز میں بحث کا آغاز کیا اور کہا،

حضور والا معزز صاحبان جیوری! مجھے مقدمے کے واقعے کے بارے میں کچھ نہیں
کہنا ہے کیونکہ جہاں تک وقوعے کا تعلق ہے وہ ثابت ہو چکا ہے۔ مجھے صرف اتنا
عرض کرنا ہے کہ میرا یہ اقدام اس قانون پر مبنی تھا اور یہ آئین جو آج چین کی سرحد
سے لیکر مراکش تک جاری و ساری ہے جسے کئی حکومتیں اپنے پینل کوڈ کے طور استعمال
کر رہی ہیں۔ ہمارے کلچر اور ہماری تہذیب کی بنیاد ہے۔ میں جانتا ہوں عدالت اس کوڈ
سے انکار کرکے اس کے تقدس کو ٹھیس پہنچائیگی۔ لہذا میں اسے کھول کر نہیں دکھاؤنگا
لیکن مجھے جو کچھ کہنا ہے اسکے سہارے سے کہونگا۔ اس میں بار بار مذہبی پیشواؤں کو
برا کہنے کی سخت ممانعت کی گئی ہے۔ مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ یہ اپنی نوعیت کا پہلا حادثہ
نہیں۔ گذشتہ چند سال میں ایسی متعدد وارداتیں ہو چکی ہیں۔ خصوصاً دلی اور لاہور میں بالکل
اسی نوعیت کے دو قتل ہو چکے ہیں۔

حضور والا، صاحبان جیوری! ہر شخص جانتا ہے کہ فطرت انسانی دوسرے کی بدزبانی
برداشت نہیں کر سکتی۔ اس سے نفسیاتی طور پر جواب اور انتقام کا جذبہ پیدا ہوتا ہے
جس کے نتیجے میں انسان اپنی استطاعت کے مطابق زبان، قلم یا ڈنڈے سے کام لیکر
اپنی انا کی تسکین کرتا ہے۔ اگر گذشتہ واقعات کے فوراً بعد قانون اس قسم کی حرکتوں کے
انسداد کیلئے کوئی موثر کارروائی کرتا تو نتھو رام کی واردات قتل ہرگز ہونے نہ پاتی۔ مسلمان
ایک عرصے سے ہندو اکثریت اور برطانوی حکومت کو سمجھا رہا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم
انکے جذبات اور حسیات کی شہ رگ ہیں۔ حضورؐ کے معاملے میں اتنا ذکی الحس واقع ہوا
ہے کہ معمولی سی گستاخی پر بھی اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتا ہے۔ دوسرے کی جان تو ایک طرف
وہ خود اپنی جان کی کوئی قیمت نہیں سمجھتا۔ لیکن نہ ہندو اکثریت نے اس طرف دھیان دیا
نہ برطانوی حکومت کے کانوں پر جوں رینگی۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ ماہر نفسیات ہونے کی حیثیت
سے میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر اس مسئلے کی طرف توجہ نہ دی گئی تو ایسے

ہولناک واقعات آئندہ بھی ہوتے رہیں گے۔ انہیں نہ ہندو اکثریت روک سکیگی اور نہ تعزیرات ہند کی کوئی دفعہ۔"

اس مرحلے پر جج نے مداخلت کی ہاتھ کے اشارے سے مجھے روکا اور پہلو بدلتے ہوئے بولا۔

"کیا فاضل جیوری اپنی بحث سے فرقہ وارانہ منافرت کو نہیں اُبھار رہے ہیں؟"

"حضور والا!" میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے جواب دیا!

"منافرت کا مخرج اور سرچشمہ جہاں سے دراصل وہیں سے نفرت کے جذبات اُبھر رہے ہیں میں تو مقتول نتھورام کی کتاب "تاریخ اسلام" کے اُبھارے ہوئے جذبۂ منافرت کے عوامل و نتائج پر تقریر کر رہا تھا۔ میں پھر عرض کرتا ہوں اس ضمن میں مسلمانوں کے اعصاب توازن برقرار رکھنے سے قاصر ہیں۔ اس لئے نہ وہ تعزیرات ہند سے گھبرائیںگا نہ پھانسی کے پھندے سے ڈریگا حتیٰ کہ چین سے مراکش تک پھیلے ہوئے مسلمانوں کا بچہ بچہ اس فتنے کا سر کچلنے کیلئے میدان میں آجائیگا۔ میں چاہتا ہوں ایسی صورت سے دوچار ہونے والے مسلمانوں کو سوچ سمجھ کر اٹھایا ہوا اقدام بھی فوری اشتعال کی تعریف میں آنا چاہیئے۔

اس مرحلے پر میں نے قرآن مجید کو ذرا بلند کرتے ہوئے کہا

"حضور والا! جو کچھ میں نے کیا ہے اس قانون کی رُو سے اپنا فرض سمجھ کر کیا ہے جس کے ساتھ چودہ سو برس سے میں نے پیمانِ وفا باندھ رکھا ہے اور جن خطوط پر پشت ہا پشت سے میرا تہذیبی ماحول تشکیل ہوتا چلا آرہا ہے۔ میں نے اپنی دانست میں قانون کو نہیں انصاف کو اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔ میرے اس اقدام میں شدید اور فوری غیظ کی عمل فرمائی تو ضرور ہے مگر قاتل کے سے جذبے کا کوئی شائبہ دور دور تک نہیں ہے۔ پھر سب سے زیادہ معصوم جذبہ اس عہد کی پاسداری ہے جس پر میرے ایمان کی بنیاد ہے اور یہی چیز مجھے بے قصور اور سزا سے بری قرار دے سکتی ہے!"

جج میری تقریر پر بہت جزبز ہوا۔ شاید یہ منطقی بحث اس کے مزاج کے لئے قابل قبول نہ تھی

مگر میرے پاس بھی اپنے دفاع کو مستحکم کرنے کیلئے کوئی اور دلیل نہ تھی۔ اس نے "عہد کی پاسداری" کے الفاظ دہرائے اور بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "تم اپنے فہم وتدبر اور سطح سے نیچے بات کر رہے ہو۔ تمہارے جیسے فاضل محقق سے اس کی توقع نہ تھی۔"

مجھے وکیل کی جبلت کے برعکس تاؤ آگیا۔ پینترا بدلا اور کہا۔

"حضور والا! یوں سمجھ لیجئے۔ کچھ اسی قسم کے عہد کی پاسداری نہ کرنے پر ۴ اگست ۱۹۱۴ء ہمارے شہنشاہ جارج پنجم نے ایک چھوٹے سے ملک کیخلاف اعلان جنگ کر دیا تھا عظیم برطانیہ کو اس جنگ میں سب سے بڑے رکن کی صورت میں شامل ہونا پڑا۔ ایک چھوٹے سے عہد کی خلاف ورزی کی صورت میں وہ خونریزی ہوئی کہ لاکھوں بچے یتیم ہو گئے۔ لکھو کھا عورتوں کے سہاگ لٹ گئے اور دنیا کا جغرافیہ کچھ سے کچھ ہو گیا۔ میں نے جس عہد کا ذکر کیا ہے اس میں آج پچاس کروڑ مسلمان جکڑے ہوئے ہیں۔ جو کسی قانونی دفعہ، پھانسی کے پھندے یا تلوار کے گھاؤ کے ڈر سے اس عہد سے روگردانی نہیں کر سکتے۔ بعد ازاں یہاں تک "ناموس محمد" کا سوال ہے مسلمانوں کا رونگٹا رونگٹا عبدالقیوم ہے۔ بس میری غرض ہے کہ ایک ایسے معصوم انسان کو جو ذہنی اور تربیتی طور پر بلا سند عقیدہ "BLIND FAITH" کی رسی میں جکڑا ہوا ہے جو ایک ان پڑھ دیہاتی نوجوان ہے اور اپنی افتاد طبع کے مطابق فوری اشتعال کے تحت اس فعل کا مرتکب ہوا۔ جس کو آج بھی وہ اپنا فرض عین سمجھ رہا ہے۔ اسے کسی سزا کا مستوجب نہیں ہونا چاہیئے۔ اور اگر عدالت یہ سمجھتی ہے کہ وہ اپنی حدود سے تجاوز کر گیا ہے تو اسے تھوڑی بہت قید بامشقت سے زیادہ کی سزا نہیں دی جانی چاہیئے۔ آپ کی عدالت جنسی رقابت کے معاملے میں رقیب کو دن دہاڑے قتل کرنے والے اقبالی مجرم کو بری کر سکتی ہے۔ اور اراضی کے قبضے اور بید خلی کے سلسلے میں مالک کو ہلاک کرنے والے مزارع کیلئے چار چھ سال کی سزا کافی سمجھتی ہے تو عبدالقیوم کے معاملے میں کیوں نرمی سے کام نہیں لے سکتی۔"

عدالت نے بحث سننے کے بعد اسی دن فیصلے کی تاریخ کا اعلان کر دیا۔ مقررہ تاریخ پر دفتری اوقات

شروع ہونے سے پہلے ہندو اور مسلمانوں کا ہجوم عدالت کے باہر جمع ہو گیا کراچی کے علاوہ حیدر آباد، ٹھٹھہ نوابشاہ، بہاولپور اور پنجاب تک سے لوگ کشاں کشاں آئے تھے نظم و نسق کیلئے پولیس کی بھاری تعداد موجود تھی۔ مشہور ہندو لیڈر، وکیل اور صحافی آئے ہوئے تھے مسلم اکابرین میں سے متعدد اصحاب تشریف لائے تھے۔ ہندو مسلمان سب امید و بیم میں تھے البتہ جن مسلم اصحاب کو خفیہ ذرائع سے معلوم ہو گیا تھا کہ جیوری کی اکثریت سزائے موت کی بجائے حبس دوام کے حق میں ہے۔ وہ اسی کو غنیمت جان کر قدرے مطمئن تھے۔ میں وکیلوں کی صف میں ایک کرسی پر بیٹھا یہ سب نقشہ دیکھ رہا تھا اضطراب اور بے چینی کی کیفیت طاری تھی۔ اچانک ڈائس پر جج نمودار ہوا میرا دل دھک دھک کرنے لگا میں نے قبل ازیں قتل کے کئی مقدمات کی پیروی کی تھی۔ جن میں سے بعض کو پھانسی ہوئی بعض رہا ہوئے۔ مگر دل کی یہ کیفیت پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ تقریباً دو منٹ موت کی سی خاموشی طاری رہی پھر جج کے اشارے پر پیش کار نے چپراسی سے کہا کہ ملزم حاضر کیا جائے۔ غازی بیڑیاں پہنے سر اٹھائے مسلح پولیس کے محافظوں کے حلقے میں عدالت کے کٹہرے میں آ کھڑا ہوا۔ پھر ایک عجیب سناٹا چھا گیا۔ جج نے ایک فائل الٹ پلٹ کر دیکھی۔ اور ریڈر سے کچھ سرگوشی کی۔ اس نے ایک کاغذ کی طرف اشارہ کیا۔ جج نے وہی کاغذ اٹھایا اور دھیمی آواز میں پڑھ کر سنایا۔

"عبدالقیوم تمہیں موت کی سزا دی جاتی ہے۔"

غازی عبدالقیوم کے منہ سے ذرا تھرتھرائی ہوئی آواز میں بے ساختہ نکلا۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ! پھر کچھ سنبھلا اور تن کر کھڑا ہو گیا۔ دیکھنے والوں کو یوں محسوس ہوا۔ جیسے اس کا قد ایک فٹ اونچا ہو گیا ہے آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک ابھر آئی۔ جس میں بے پایاں مسرت ملی ہوئی تھی۔ اس کے لب ہلے حاضرین نے سنا وہ کہہ رہا تھا:

"جج صاحب! میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے اس سزا کا مستحق سمجھا یہ ایک جان کیا چیز ہے میرے پاس لاکھ جانیں ہوتیں۔ تو وہ بھی ایک ایک کر کے اسی طرح اپنے آقا (صلی اللہ علیہ وسلم) پر قربان کر دیتا۔ اَللّٰہُ اَکْبَرُ!"

یہ نعرۂ مستانہ اس زور سے گونجا کہ اس کی گونج کمرۂ عدالت، گیلری، برآمدے اور باہر والوں

نے بھی سنی۔ وہ سمجھے عبدالقیوم بری ہو گیا آگے کا المیہ بڑا ہی دردناک اور سنگین ہے عبدالقیوم تو حکم سن کر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوا جیل کو چلا گیا اور مجھے حکومت نے پروفیشنل مس کنڈکٹ (PROFESSIONAL MIS-CONDUCT) کا نوٹس دے دیا جس میں حدود قانون سے متجاوز ہو کر بحث کرنے کا الزام تھا۔ میں نے دوسری عدالت میں اس الزام کو غلط اور بے بنیاد ثابت کر کے پہلی عدالت کی جہالت پر مہر ثبت کی۔

چند روز بعد میں نے مولوی ثناء اللہ صاحب اور مولانا عبدالعزیز پر مشتمل وفد اپنے استاد علامہ اقبال کی خدمت میں بھیجا۔ کہ سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کرانے کیلئے وائسرائے تک سفارش پہنچائیں۔ مرحوم نے جو جواب دیا اس کا ذکر شروع میں کر چکا ہوں۔ میں نے ایک طرف یہ وفد علامہ کے پاس بھیجا۔ دوسری طرف گورنر بمبئی کے نام رحم کی عرضداشت بھیج دی۔ اس کا جواب ملا۔ "درخواست زیر غور ہے"۔ دو ہفتے تک آپ کو نتیجے سے مطلع کر دیا جائیگا"۔ گورنر کا جواب ملے تیسرا روز تھا کہ صبح کے وقت میں نے اپنے دفتر میں سنا کہ رات کو عبدالقیوم کو پھانسی دے دی گئی۔ میں مولانا عبدالعزیز کو لیکر جیل پہنچا۔ تو پرائیویٹ ذریعے سے پتہ چلا کہ صبح اذان کے وقت غازی کے لواحقین کو انکی جائے قیام پر جگا کر بتایا گیا کہ "عبدالقیوم کو پھانسی دے دی گئی ہے۔ لاش کو پولیس سرکاری گاڑی میں رکھ کر میوہ شاہ قبرستان میں لے گئی ہے جنازہ تیار ہے۔ منہ دیکھنا ہے تو جلد چلو"۔ ہم لوگ جیل سے قبرستان پہنچے تو معلوم ہوا کہ میت قبر میں اتاری جا چکی تھی۔ کہ مسلمانوں کا جم غفیر وہاں پہنچ گیا اور اس نے مٹی ڈالنے نہ دی تھی۔ ایک جوشیلا کارکن قلندر خان قبر میں کود گیا اور میت کو لحد سے نکالا چارپائی کفن وغیرہ کا بندوبست پہلے سے ہو چکا تھا۔ فوراً لاش کو کفنایا اور جنازہ لیکر روانہ ہو گئے۔ یہ خبر آگ کی طرح پورے شہر میں پھیل گئی۔ کراچی مسلم اکثریت کا شہر تھا۔ اور صبح کا وقت۔ دیکھتے ہی دیکھتے دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ کے باوجود دس ہزار مسلمان جمع ہو گئے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے فوراً فوج طلب کر لی۔

ہم اس عرصہ میں راستہ کاٹ کر چاکیواڑہ کے قریب ایک تنگ گلی سے گذر کر جنازہ کے قریب پہنچ گئے۔ بے پناہ ہجوم تھا۔ کندھا دینے والوں میں قلندر خان خاصا نمایاں نظر آ رہا تھا۔ اچانک ہجوم کا ریلا

آیا۔ اور پھر برابر والی پتلی گلی سے "تڑ تڑ" کی آواز گونجی نظر اٹھا کر آگے کا جائزہ لیا، تو قلندر خان کے بدن سے خون کا فوارہ اچھلتے دیکھا اس کے باوجود وہ لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ جنازے کو کندھا دیئے جا رہا تھا، چند منٹ بعد وہ زخموں سے نڈھال ہو کر گر پڑا، اتنے میں پھر گولیوں کی بوچھاڑ آئی۔ ہم بھاگ کر موٹر تک آئے اور موٹر میں بیٹھ کر راہ فرار اختیار کی۔ نہتے اور پر امن جلوس پر گوروں نے بے تحاشا فائرنگ کی سینکڑوں مسلمان شہید اور ہزاروں مجروح ہو گئے۔ اندھا دھند فائرنگ کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ مکانوں اور جھونپڑیوں میں بیٹھے ہوئے بچے بوڑھے اور عورتیں بھی اس کا نشانہ بن گئیں۔

حالات قدرے پرسکون ہوئے تو میں، مولانا عبدالخالق، مولانا عبدالعزیز اور حاتم علوی زخمیوں کی عیادت کیلئے ہسپتال گئے۔ ہسپتال کے ارد گرد پولیس کی بھاری تعداد اور کچھ فوج بھی موجود تھی۔ ہم کسی نہ کسی طرح شہیدوں اور زخمیوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ جہاں تک میری یادداشت کا تعلق ہے میں نے ایک سو چھ لاشیں گنیں۔ اور بعد میں ان کی تعداد ایک سو بیس ہو گئی۔ سسکتے، کراہتے اور چیختے ہوئے زخمی الگ۔ بڑی تعداد ایسے زخمیوں کی تھی جن کے ہاتھ پاؤں کی ہڈیوں کے ٹکڑے اڑ گئے تھے۔ حادثہ اتنا ہیبت ناک تھا کہ بیان کرنے کیلئے الفاظ نہیں ملتے۔ پھر صبح کے وقت جب جوانوں عورتوں بچوں اور بوڑھوں کے ہاتھ پاؤں سے بھری ہوئی ایک ویگن ہسپتال سے نکلی تو بے اختیار میری چیخ نکل گئی، بلکہ کئی دن تک حواس بجا نہ ہوئے، خواب و خور حرام ہو گیا۔ بیشمار لاشیں ان کے وارثوں نے پولیس میں رپٹ دیئے بغیر چپکے سے دفن کر دیں۔

اتفاق سے ان دنوں دہلی میں مرکزی اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا، ہم نے وائسرائے کے نام ایک تار دیا، ساتھ ہی ایک قاصد بذریعہ ریل قائد اعظم کے پاس روانہ کیا۔ کراچی میں ہم نے مسلم ریلیف کمیٹی قائم کی۔ جس کی امداد کے لئے دہلی اور لاہور دونوں نے چندے دیئے۔ ادھر قائد اعظم نے اسمبلی میں آواز بلند کی۔ پھر تو ہماری آواز برٹش پارلیمنٹ کے ایوانوں میں گونجی۔ سر ونسٹن چرچل تک نے اظہار تاسف کیا

شمع رسالتؐ کے پروانے کی ایمان پرور داستان تاریخ عالم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ثبت ہو گئی.

غازی عبدالقیوم ناموس پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) پر قربان ہو گئے. انہیں مرتبہ شہادت نصیب ہوا. آپ کی موت نے مسلمانوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کٹ مرنے کا بے پناہ جذبہ پیدا کر دیا. اور مردہ قوم میں زندگی کے آثار پیدا ہو گئے.

۵

تمہیں سے اے مجاہدو! جہان کو ثبات ہے
شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے

تحریکِ پاکستان

پاکستان جس کو ایک خاص خطۂ ارض سے منسوب کیا جاتا ہے دراصل اس تحریک کا نام ہے جو نیل کے ساحل سے لیکر تا بخاک کاشغر کہیں اسلام کی سربلندی کیلئے، کہیں اس کی ترویج و ترقی کیلئے اور کہیں اس کی بقاء اور برقراری کیلئے چلائی جارہی ہے اگر ایک طرف قبرص میں ترکی مسلمان اس کا علم اونچا کر رہے ہیں۔ دوسری طرف برما کے ساحلی علاقہ اراکان میں برمی مسلمانوں کے ہاتھوں اس کا پرچم بلند کیا جارہا ہے۔ جس طرح الجزائر کی جنگِ آزادی اس تحریک کا دوسرا نام تھا۔ اسی طرح انڈونیشیائی باشندوں کی ولندیزیوں کے ساتھ نبرد آزمائی بھی اسی تحریک کا نقش ثانی تھی۔ مصر کی اخوان المسلمون ہو یا ترکی کی نوری یا فلسطین کی جدوجہد آزادی سب اسی تحریک کے علم بردار ہیں۔ برصغیر میں بھی اسی تحریک کو مختلف ادوار میں مختلف ناموں سے پکارا گیا کبھی اس کو "غدر" کے نام سے اور کبھی سکھوں کے خلاف جہاد کے نام منسوب کیا گیا کبھی تحریک ریشمی رومال اور تحریک خلافت کہا گیا اور کبھی "قرار داد لاہور" کا نام دیا گیا۔ آج بھی بھارت میں یہ تحریک زندہ اور تابندہ ہے۔ اردو کو سرکاری زبان بنانے کی کوشش ہو، رانچی، جمشید پور اور احمد آباد کے خونیں واقعات ہوں یا حیدر آباد دکن کے رضا کاروں کی قربانیاں یہ سب اسی تحریک کے مختلف مظاہر ہیں۔

برصغیر میں تحریک پاکستان کا پس منظر اسی دن ترتیب پانے لگا اورنگزیب عالمگیر کی وفات مسلمانوں کے خاتمے کا دن تھا۔ انگریز قوم کی عیاریاں، ہمدردی اور محبت کا روپ دھار کر منظر عام پر آنے لگیں۔ ریشہ دوانیاں اور سیاسی توڑ جوڑ اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ ایسے حالات میں جس صاحب بصیرت نے آنے والے خطرات کو بھانپ کر میدان عمل میں قدم رکھا اور سبز ہلالی پرچم کی سربلندی کی خاطر جان کی بازی لگادی۔ وہ ایک عالم دین تھا

جس کی شخصیت کی آج بھی دنیا معترف ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ (محدث دہلوی) نے ایک طرف ایمان و حرارت کی چنگاریوں کو فروزاں رکھنے کی کوشش کی۔ اور دوسری طرف عسکری تربیت کے نظام کا ایک جال بچھا دیا۔ جو بعد میں سرفروشوں کیلئے مشعل راہ بنا۔
دہلی کا چراغ ابھی بجھا نہیں تھا۔ مگر اس کی تابنا کی ماند ضرور پڑ چکی تھی۔ حکومت دراصل انگریزوں کی تھی۔ انہوں نے خود غرض عناصر کو اپنا بنا لیا تھا۔ جنہوں نے ایمان اور ضمیر کو دولت کی بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ جنگ پلاسی نے ایسے ضمیر فروش غدار وطن میر جعفر کی وجہ سے تاج برطانیہ کی اندھیری شب کو صبح صادق میں بدل دیا تھا۔ مسلمانان بنگال پر بربریت کے دروازے کھول دیئے اور دوسری طرف جنوبی ہند کی سرزمین دکن صادق کے کئے کی سزا بھگت رہی تھی۔ ان حالات میں "شاہ ولی اللہ" کی فکری تحریک نے غلامی کے اندھیروں میں آزادی کی شمع روشن کرنے کی ٹھان لی۔ انہی کے تربیت یافتہ مولنا ابو شاہ سعید اور ان کے صاحبزادے مولنا ابو اللیث نے اپنے مریدان خاص سلطان حیدر علی اور سلطان ٹیپو کو سامراج کے بالمقابل میدان کارزار میں لا کھڑا کیا۔ رب کعبہ پر غیر متزلزل یقین رکھنے والے ان فرزندان اسلام کی زیر قیادت مسلم افواج نے انگریزوں کو پے در پے شکستیں دیں اور ثابت کر دیا کہ مسلم کثرت افواج پر ناز نہیں کرتا۔ بلکہ توحید کے پرستار کفر اور الحاد کے گھٹا ٹوپ اندھیروں کو منور کرنے کیلئے آگے بڑھتے ہیں۔ اور یہ امر مسلمہ ہے کہ مسلمانوں نے اقلیت ہونے کے باوجود کبھی شکست نہیں کھائی۔ البتہ اپنوں کی غداری اور بیوفائی انہیں غلامی کے تیرہ و تار سمندروں میں دھکیلتی رہی ہے۔ یہی کچھ تاریخ کے ہر دور میں فدایان اسلام کے ساتھ پیش آیا۔ اور یہی کچھ شیدائی اسلام سلطان ٹیپو شہید سے ہوا۔ لیکن آزادی ہند کے اس پروانہ نے گیدڑ کی سو سالہ زندگی کو شیر کے ایک لمحہ پر قربان کر دیا۔ اس طرح اللہ والوں نے غلامی کی شب تاریک میں اجالا کرنے کی کوشش کی

گماں آباد ہستی میں یقیں مرد مسلماں کا
بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی

سنہ ۱۸۰۲ء کا واقعہ ہے کہ چند غیور مسلمانوں نے مولانا شریعت اللہ کی زیر قیادت ایک تحریک چلائی، جو تاریخ میں "فرائضی تحریک" کے نام سے مشہور ہوئی جس نے برطانوی راج کو عملاً مفلوج کر دیا۔ انگریزوں نے اس تحریک کو کچلنے کیلئے ہر حربہ استعمال کیا۔ کئی افراد قید و بند کی صعوبتوں سے دو چار ہوئے، اور سینکڑوں دار و رسن کے مرحلے پر پہنچے۔ مگر اہل ایمان کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی۔ قتل عام شروع ہو گیا، تحریک وقتی طور پر دب گئی، لیکن زیر زمین اس تحریک کے شرارے سلگتے رہے۔

دہلی میں حضرت شاہ ولی اللہ رح کے بعد ان کے مشن کو زندہ رکھنے کیلئے مولانا عبدالعزیز رح نے اپنے آپ کو پیش کیا، اور اپنے تدبر و فراست سے ہزاروں انقلابی ذہنوں کو تیار کیا۔ ان مخدوش حالات کو بھانپ کر انگریزوں نے اس تحریک کو کچلنے کے لئے اپنی فطرت کے عین مطابق اوچھے ہتھیار استعمال کئے۔ شاہ صاحب کی جائداد ضبط کر لی گئی، طرح طرح کے مصائب سے آزمائے گئے۔ آپ نے ہندوستان کو "دارالحرب" قرار دیا۔ ملک کے علماء و مشائخ کرام کو ایک لڑی میں منسلک کر دیا۔ ایک ایسی تحریک برپا کی، جو انگریزوں کیلئے دردِ سر بن گئی۔ ان سرفروشوں نے اپنا خون دے کر جد و جہد آزادی کو پروان چڑھایا۔ شاہ صاحب رح کی وفات کے بعد آپ کے جانشین سید احمد شہید رح مقرر ہوئے۔

حضرت سید احمد شہید رح نے اپنی تحریک سے روشناس کرنے کیلئے ملک بھر کے دورے کئے۔ دہلی سے بنگال تک اور راس کماری سے ہمالہ کی پہاڑیوں تک کچھ ایسا فسوں پھونکا کہ برصغیر میں ایک طوفان امڈ آیا۔ اور حضرت سید احمد شہید رح کی زیر قیادت مختصر سی جماعت نے سرحد پر پڑاؤ ڈالے۔ اور یہیں سے جد و جہد آزادی کیلئے آغاز کر دیا۔ سامراج ان حملوں کی شدت سے گھبرا اٹھا۔ بالآخر بالاکوٹ میں حق و باطل کا آخری معرکہ ہوا۔ حضرت

سید احمد شہیدؒ اور ان کے جاں نثاروں نے آزادئ وطن کی خاطر خون دے کر تاریخ عالم میں روشن باب ثبت کر دیا۔

جس وقت مجاہدین "کوہستان ہزارہ" اور سرحدی علاقوں میں اپنے اسلاف کی روایات زندہ کر رہے تھے۔ مشرقی محاذ "بنگال" پر میر نثار علی عرف تیتو نے علم جہاد بلند کیا اور ضلع فرید پور میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ مگر تیتو میر بھی شہید کر دیئے اور ان کے دست راست مولانا مسکین شاہ کو گرفتار کر کے تختۂ دار پر لٹکا یا گیا۔ انگریز سمجھتے تھے کہ اب کوئی اور تحریک نمودار نہ پا سکے گی۔ لیکن انہیں کیا معلوم تھا کہ جو بیج شاہ ولی اللہ بو گئے ہیں۔ اس کا بار آور ہونا ناگزیر ہے حالات کے تند و تیز جھونکے اس شمع کو بجھا نہیں سکتے۔ جس کا کام اندھیروں میں اجالا کرنا ہوتا ہے۔ مولانا یحییٰ علی اور مولانا بدیع الزمان بردواجی کی مساعی جمیلہ سے چند دنوں میں بنگال کے جاں نثاروں کی تعداد اسّی ہزار تک پہنچ گئی۔

مولانا ولایت علی نے گوریلا طرز کی جنگ لڑنا شروع کی کھل کر یلغار کرنے کی بجائے سرحدی چوکیوں پر حملے کر کے تہ تیغ کرتے تھے۔ انگریزوں نے اس کے سدباب کیلئے کوشش کی۔ ہر چند ناکام ہوئے۔ ۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۸ء تک انہوں نے مہمیں بھیجیں۔ جن کی مجموعی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔ پنجاب کی چھاؤنیاں خالی ہو گئیں۔ لیکن اس کے باوجود انہیں قدم قدم پر ہزیمت اور شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اگرچہ ان کی عیاریوں کے باعث پسپا ہوئے۔ لیکن اس کے باوجود مجاہدین متواتر چالیس سال تک انگریزوں کی بڑھتی ہوئی قوت پر مسلسل کاری ضربیں لگاتے رہے۔

۱۹۰۵ء میں "ریشمی رومال کی تحریک" مولانا محمود الحسنؒ کی سرکردگی میں اٹھی لیکن والی افغانستان حبیب اللہ خان کی غداری سے بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔ اور ریشمی رومال کی تحریک کی ناکامی کے بعد خلافت کی انقلاب آفریں تحریک اٹھی۔ اس تحریک کی روح بھی اسلامی تھی۔ مگر ترکی کے انقلاب اور ہندو ذہن کی عیاریوں نے اس کی جڑیں ہلا کر رکھ دیں۔ تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں۔ کہ برصغیر میں آزادی کی منزل کو قریب تر لانے میں تحریک خلافت نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے

"تحریک خلافت کے دوران "تحریک ہجرت" کی چنگاریاں اٹھیں۔ لاکھوں افراد جذبات کی رو میں بہہ کر کابل چلے گئے جب وہاں خاطر خواہ انتظام نہ ہو سکا تو بعد دیگرے واپس آ گئے ادھر ملک میں خلافت کے ہنگامے سرد ہو چکے تھے۔ کانگرس کی چھری مسلمانوں کو خاموش کرنے کیلئے حرکت میں آ چکی تھی۔ شدھی اور سنگھٹن تحریکیں مسلمانوں کو اپنے میں جذب کرنے کیلئے دیوانہ وار آگے بڑھ رہی تھیں۔ فسادات کی آگ دن بدن تیز ہو رہی تھی عین اس وقت مغربی افکار سے لیس مسلم طبقہ معاشی آسودگیوں کو عزت و آزادی پر ترجیح دیتا تھا۔ اور افسوسناک صورت حال پیدا ہوئی۔ کہ علماء کا ایک طبقہ وطنیت کے فریب میں آ گیا۔ یہ بات ان کی فہم و فراست سے بالاتر تھی کہ "وطنیت کا پیرہن مذہب کا کفن ہوتا ہے"۔ ایسے نازک موقع پر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے قوم کی ژولیدہ فکری کی اصلاح۔ یاس کی افسردگی کی فضا میں ایک کرن نمودار ہوئی۔ جس نے تاریک ماحول کو منور کر دیا۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ کی "جمعیت العلماء ہند" غیر مؤثر ہو کر رہ گئی حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حجۃ الاسلام شیخ القرآن علامہ عبدالغفور ہزاروی نے فکر و دانش کی دنیا میں ایک عظیم انقلاب برپا کیا۔ باطل افکار کے تار و پود بکھیرے اور مصنوعی عظمتوں کو زمین بوس کر دیا۔ انہوں نے بھانپ لیا تھا کہ ہندو اور مسلمان دونوں آزادی چاہتے ہیں۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ کا سیاسی کردار خاص طور پر نمایاں ہے کہ وہ پہلے عالم دین ہیں جنہوں نے اس کا اعلان پوری وضاحت سے کر دیا۔ کہ مسلمان اور ہندو کبھی ایک ساتھ نہیں رہ سکتے اور مسلمانوں کو جنگ آزادی آخر میں خود لڑنی ہو گی۔ انہوں نے کہا تھا۔

"دل چاہتا ہے کہ ایک خطہ پر اسلامی حکومت ہو۔ سارے قوانین کا اجراء احکام شریعت کے مطابق ہو۔ بیت المال اور شرعی نظام ہو۔۔۔"

یہ آواز اپنی آب و تاب کے ساتھ مسلم لیگ کے ہنگامہ خیز اجلاس ۱۹۳۰ء میں الہ آباد میں سنی گئی۔ علامہ اقبال کے اس صدارتی خطبہ کو "پاکستان کا تخیل" کہا جا سکتا ہے اس خطبہ میں آپ نے فرمایا۔

"اسلام ایک ایسی زندہ و پائندہ قوت ہے جو نگاہِ انسانی کو جغرافیائی حدود و قیود سے آزاد کر کے اس کی فطری وسعتوں میں اذنِ بال کشائی دیتا ہے میرا عقیدہ ہے کہ مذہب انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں ایک اہم ترین طاقت ہے اور میرا محکم یقین ہے کہ اسلام خود تقدیرِ الٰہی ہے۔ زمانے کی تقدیریں اس کے ہاتھ میں ہیں۔ اور اس کی تقدیر کسی کے ہاتھ میں نہیں۔"

اسلامی ہندوستان کے متعلق فرمایا:۔

"ہندوستان دنیا میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے۔"

پھر فرمایا:۔

"ہندوستان میں ایک اسلامی ریاست کے متعلق میرا مطالبہ ہندوستان اور مسلمانانِ ہند کے بہترین مفاد پر مبنی ہے۔ اس سے اندرونی طاقتوں میں توازن ہو جائیگا۔ اس لئے ملک میں دائمی امن و امان قائم رہیگا۔ ہندوستان کو فائدہ ہوگا اور اسلام کو موقع ملیگا کہ اس پر اجنبی ملوکیت سے جو غیر اسلامی اثرات غالب آ چکے تھے ان سے خلاصی حاصل کریں۔ اور اپنے شرعی قوانین اپنی تعلیم و کلچر کی تنظیم کر کے انہیں اپنی اصلی روح اور عصرِ حاضر کی ضروریات سے قریب تر لا سکیں۔"

علامہ اقبال کے اس خطبے[1] نے گہرے اثرات مرتب کئے۔ بانجھ ذہنوں سے فکر و شعور کی نئی

---

[1] ہندوؤں نے علامہ اقبال کی اس تجویز کو ایک شاعرانہ تخیل سے زیادہ وقعت نہ دی مگر ایک مختصر سی جماعت جس میں چوہدری رحمت علی مرحوم جو لندن میں مقیم تھے اس خیال کی نشر و اشاعت کرتے رہے جو ۱۹۴۰ء میں قائداعظم کی عظیم الشان قیادت میں برصغیر کے مسلمانوں کا نصب العین قرار پایا اور "لے کے رہیں گے پاکستان" کے نعروں نے برصغیر کے در و بام کو جھنجھوڑنا شروع کر دیا۔

لہریں اٹھنے لگیں علماء نے ہندو ذہنیت اور دطنیت کے بت سنگین کو پاش پاش کر دینے کیلئے منظم جد و جہد شروع کی۔ مولانا عبد الحامد بدایونی، عبد الماجد دریا آبادی اور مولانا جمال الدین فرنگی محل نے مسلم قومیت پر پُر مغز اور زوردار مقالوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ جن میں مسلمانوں کے سیاسی اور تہذیبی احیاء کے نشو و نما کیلئے تین متبادل حل پیش کئے جن میں آخری حل تقسیم ملک کا تھا۔ مسلمانوں کی بقاء و سالمیت کیلئے عام حالات کے پیش نظر مختلف علماء اور ارباب فکر نے مختلف خاکے تیار کئے ان میں مولانا آزاد سبحانی کا تصور "خلافت ربانی" چوہدری افضل حق کا "اسلامی ریاست" اور سید ابو الاعلیٰ مودودی کی "حکومت الٰہیہ" خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

صوبہ سرحد نے گول میز کانفرنس کے مراحل دیکھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ صوبہ سرحد کو ہندوستان کے معاملات میں شامل کیا گیا تھا۔ سائمن کمیشن کی سفارشات سامنے آ چکی تھیں۔ ان میں صوبہ سرحد میں توسیع اصلاحات پر بڑا زور دیا گیا۔ گول میز کانفرنس میں صاحبزادہ عبد القیوم خان نے صوبہ سرحد کی نمائندگی کی۔ اس موقع پر بھی ہندوؤں نے مسلمانوں کے سینے میں تیر پیوست کرنا چاہا۔ گاندھی جی نے مطالبہ کیا۔ صرف انہیں پورے ہندوستان کی طرف سے واحد نمائندے کی حیثیت سے بلایا جائے۔ لیکن گاندھی جی کو اس محاذ پر شکست کھانی پڑی۔

سیاسی قائدین سے مذاکرات کے بعد سنہ ۱۹۳۵ء کا ایکٹ سامنے آیا۔ یہ بھی متنازعہ فیہ تھا لیکن کانگرس اور مسلم لیگ نے اس کے تحت انتخاب میں حصہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اب صوبہ سرحد کی اسمبلی میں صرف پچاس نشستیں تھیں۔ اس وقت کی صورت حال یہ تھی کہ خدائی خدمت گار اور کانگرس ایک سیاسی جماعت سمجھے جاتے تھے جمعیت خلافت کے اب بھی خاصے اثرات تھے چند سیاسی قائدین اپنی سیاسی شخصیت کی بنا پر چمک اٹھے۔ ان میں سردار عبد الرب نشتر کا نمایاں مقام تھا۔

صوبہ سرحد میں سنہ ۱۹۳۶ء کے انتخاب میں سرخپوشوں اور کانگرسیوں نے پچاس نشستوں

میں سے انیس نشستیں حاصل کیں۔ بارہ نشستیں غیر مسلموں کیلئے مخصوص تھیں۔ اس انتخاب میں ضلع ہزارہ سے مندرجہ ذیل اصحاب منتخب ہوئے

تحصیل ھری پور:۔

۱۔ سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان آپ ٹوپی (اتمان) حلقہ اور خانپور ہزارہ دو حلقوں سے بیک وقت کھڑے ہوئے ٹوپی کے حلقہ سے ہار گئے مسلم یونائیٹڈ پارٹی

۲۔ محمد سرور خان طاہر خیلی سلم کھنڈ ڈیموکریٹک پارٹی

۳۔ عبدالحمید خان تلوکر یونائیٹڈ مسلم پارٹی

۴۔ محمد زمان خان کھلابٹ یونائیٹڈ مسلم پارٹی

تحصیل ایبٹ آباد:۔

۱۔ رائے بہادر لالہ ایشرداس نواں شہر ہندو سکھ نیشنلسٹ پارٹی

۲۔ راجہ عبدالرحمٰن خان نگری ٹوٹیال ڈیموکریٹک پارٹی

۳۔ پیر محمد کامران رجوعیہ کانگرس

۴۔ رائیصاحب پرمانند ایبٹ آباد ہندو سکھ نیشنلسٹ پارٹی

تحصیل مانسہرہ:۔

۱۔ خان محمد عطائی خان بٹل ڈیموکریٹک پارٹی

۲۔ خان محمد عباس خان سم الٰہی منگ ڈیموکریٹک پارٹی

۳۔ فقیرا خان ملک پور کانگرس

مسلم نیشنلسٹ پارٹی زیر سرکردگی سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان بنی۔ اور کانگرس پارٹی زیر قیادت ڈاکٹر خان صاحب تھی۔ رائے بہادر لالہ ایشرداس ہندو سکھ نیشنلسٹ پارٹی میں شامل ہوئے۔ اغلباً وہ اس کے لیڈر تھے۔ صرف ہزارہ کے چار ممبران ڈیموکریٹک پارٹی میں شامل تھے۔ پہلی وزارت سرحد نواب سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان نے بہ امداد ہندو سکھ

نیشنلسٹ پارٹی بنائی۔ لیکن چھ ماہ سے زیادہ نہ چل سکی۔ اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ انہوں نے ہزارہ سے کوئی ممبر وزیر نہ لیا۔ ڈیموکریٹک پارٹی ہزارہ کے ممبران نے صاحبزادہ عبدالقیوم خان سے کافی بات چیت کی کہ وہ ہزارہ سے ایک ممبر کو وزیر لے لیں لیکن وہ رضامند نہ ہوئے بلکہ ارشاد فرمایا "میرے باغ کے تمام مالی ہزارہ کے ہیں"۔ اس پر برانگیختہ ہوکر محمد سرور خان طاہر خیلی راجہ عبدالرحمٰن خان نگری ٹوٹیال، محمد عطائی خان ٹبل، محمد عباس خان سم الٰہی منگ ممبران ڈیموکریٹک پارٹی نے عدم اعتماد کی تحریک پیدا کی جب لیجسلیٹو اسمبلی کا اجلاس ایبٹ آباد میں ہوا۔ تو ڈیموکریٹک پارٹی نے کانگرس پارٹی کے تعاون سے صاحبزادہ صاحب کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد ۳ ستمبر ۱۹۳۷ء کو ایبٹ آباد کے ٹاؤن ہال میں پیش کی۔ اور ۲۷ ستائیس ووٹ اس کے حق میں اور بائیس ووٹ اس کے خلاف آئے۔ رائے صاحب پرمانند بیرسٹر ایبٹ آباد (نمائندہ سکھ) نے قرارداد کے حق میں ووٹ دیا یعنی ضلع ہزارہ کے حق وزارت کی تائید کی اور صاحبزادہ صاحب کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد کر کے ختم کر دیا اور اسی نسبت سے مشہور ہوا "ہزارہ از منسٹری میکر اینڈ بریکر" (Hazara is ministry maker and breaker)

اس پر گورنر سرحد نے ۳ ستمبر ۱۹۳۷ء کو ڈاکٹر خان صاحب کو وزارت بنانے کی دعوت دی۔ اس نے عبدالغفار خان، مولانا ابوالکلام آزاد، بابو راجندر پرشاد رائے اور ان کی موجودگی میں جو اس غرض سے ایبٹ آباد آئے تھے۔ وزارت بنائی۔ اس میں خان محمد عباس خان کو ڈیموکریٹک پارٹی کی طرف سے وزیر لیا گیا اور ان کو محکمہ جنگلات دیا گیا۔ نئی وزارت نے ستمبر ۱۹۳۷ء کو حلف لیا۔ اس سے پیشتر نواب سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان کے عہد وزارت میں اپریل ۱۹۳۷ء کو ملک خدا بخش سپیکر (صدر) اور محمد سرور خان طاہر خیلی ڈپٹی سپیکر (نائب صدر) مقرر ہوئے تھے۔ اور نواب صاحب سر عبدالقیوم خان اسی صدمہ کے باعث اچانک دماغ کی شریان پھٹ جانے سے (CEREBRAL-HAEMORRHAGE) فوت ہوئے۔

(نوٹ:- ملک کے انتقال کے بعد راجہ منوچہر خان پورے ممبر چنے گئے محمد سرور خان کی ممبری با در میعہ پٹیشن حسین گگی اور عبدالرشید خان طاہر خیلی منتخب ہوئے)

درحقیقت حصول پاکستان کی جدوجہد میں ضلع ہزارہ کے غیور مسلمانوں نے جو خدمات سرانجام دی ہیں۔ وہ تاریخ میں سنہری حروف سے لکھی جائینگی۔ اس وقت جبکہ صوبہ سرحد میں کانگرس کا پورا تسلط تھا۔ اور خان عبدالغفار خان کو ہندوؤں نے اپنے سیاسی جال میں پھنسا رکھا تھا ھزارہ ہی ایک ایسا ضلع تھا۔ جس نے کانگرس کا ساتھ دینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ صوبہ سرحد کی اس ایک تہائی آبادی کی کانگرس سے بغاوت کانگرسی لیڈروں کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکتی اور وہ یہ قطعاً برداشت نہ کر سکتے تھے کہ ہزارہ کے لوگ صوبہ سرحد میں شامل ہونے کے باوجود کانگرس کا ساتھ نہ دیں۔ اس لئے کانگرسی لیڈروں نے خان عبدالغفار خان پر زور دیا۔ کہ وہ ھزارہ کے لوگوں کو ہموار کرنے کی کوشش کریں چنانچہ اس مقصد کیلئے خان عبدالغفار خان متعدد بار ہزارہ آئے۔ اور انہوں نے یہاں کانگرس کا جال بچھانے کی کوشش کی۔ مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ انہیں یہاں کچھ کارکنوں کی حیثیت سے تو مل گئے مگر ان کارکنوں کو اپنے ہمنواؤں کی تعداد بڑھانے میں بڑی مشکلات پیش آئیں۔ اور وہ ھزارہ میں اپنی پارٹی منظم نہ کر سکے۔ یہی وجہ تھی کہ سرحد میں اصلاحات کے بعد پہلی مرتبہ جب صوبائی اسمبلی کے انتخاب ہوئے۔ تو ہزارہ میں کانگرس کو بری طرح شکست ہوئی۔ اور زیادہ تر ممبران آزادانہ طور پر کامیاب ہوئے۔ اہل ہزارہ ایک طرف کانگرس سے متنفر تھے اور وہ اسے ہندوؤں کی جماعت سمجھ کر اس کے نزدیک نہ پھٹکتے تھے۔ اور دوسری طرف آزادی کا جذبہ ان کے دلوں میں موجزن تھا اور وہ کسی ایسی جماعت کے متلاشی تھے جو کانگرس اور انگریز کا مقابلہ کرے

اس زمانہ میں سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان میدان میں آئے۔ اور انہوں نے کانگرس کے مقابلہ میں اپنی پارٹی بنانے کی کوشش کی۔ مگر ہزارہ کے لوگوں نے ان کا ساتھ دینے سے بھی انکار کر دیا کیونکہ ان کی معتدل پالیسی سے یہاں کے لوگ مطمئن نہیں تھے۔ علاوہ ازیں وہ کسی گروپ کا ساتھ دینے کی بجائے کسی ہمہ گیر جماعت میں شامل ہونے کے خواہشمند تھے انہی دنوں حضرت قائد اعظم محمد علی جناح پشاور تشریف لائے۔ انہوں نے صاحب زادہ

عبدالقیوم خان کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی پارٹی بنانے کی بجائے صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کی بنیاد ڈالیں۔ مگر بعض مصلحتوں کے پیش نظر صاحب زادہ صاحب اس پر آمادہ نہ ہو سکے اس موقع پر ہزارہ اور بعض دیگر اضلاع کے کچھ تعلیمیافتہ حضرات حضرت قائداعظم محمد علی جناح سے ملے۔ اور انہیں یقین دلایا کہ کانگرس کے اتنے دباؤ کے باوجود صوبہ سرحد میں کافی تعداد ایسے لوگوں کی ہے۔ جو مسلم لیگ میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ اور ہزارہ میں تو مسلم لیگ کی کافی گنجائش ہے۔ اگرچہ کافی عرصہ پہلے سے اس ضلع میں برائے نام مسلم لیگ کی تنظیم[1] موجود تھی اور اس کے کارکن میاں نورالدین صاحب مرحوم، قاضی اسدالحق ایڈوکیٹ، مسٹر عبدالرشید کیانی فتح محمد خان آف مردان، خان بہادر سعداللہ خان مرحوم، حکیم عبدالعزیز چشتی تھے۔ جسٹس سجاد احمد جان کو پہلا صدر چنا گیا تھا۔ کاغذی تنظیم کے باوجود ان حضرات کی کوشش اور اہتمام سے ۱۹۳۷ء میں ایبٹ آباد میں ایک شاندار مسلم لیگ کانفرنس ہوئی۔ جس میں مولانا شوکت علی مرحوم، مولانا عبدالحامد بدایونی، جمال میاں فرنگی محل والے اور چوہدری خلیق الزماں نے شرکت کی تھی۔ اس کا ذکر چوہدری خلیق الزمان نے اپنی کتاب "پاکستان کا راستہ" "PATH WAY TO PAKISTAN" میں کیا ہے۔

اتفاق کی بات ہے کہ ۱۹۳۸ء میں ادھر قائداعظم صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کی تنظیم کیلئے بات چیت کر رہے تھے اور کچھ لوگ کھلے طور پر مسلم لیگ کا کام بھی کرنے لگے کہ عین اس وقت نحاذی اور تربیلہ کے سرکل میں صوبائی اسمبلی کی ایک نشست خالی ہو گئی۔ اس نشست کے ضمنی انتخاب

---

[1] بقول ڈاکٹر شیر بہادر خان نبی مصنف "تاریخ ہزارہ" کہ ضلع ہزارہ میں سب سے پہلے مسلم لیگ ۱۹۲۰ء میں خان بہادر علی گوہر خان ساکن مانسہرہ نے بنائی۔ اس سے پیشتر کاغذی تنظیم تھی مانسہرہ کے مشہور و معروف قانون دان محمد اکبر خان ایڈوکیٹ اور محمد مظفر خان ایڈوکیٹ جو صاحب موصوف کے فرزند ہیں۔ صحیح معنوں میں مسلم لیگ کو منظم کرنے کا انہیں شرف حاصل ہے (مصنف)

کیلئے کانگرس نے اپنا امیدوار کھڑا کر دیا۔ اس موقع پر صوبہ سرحد کے چند مسلم لیگی لیڈروں نے ۔ جو بے سروسامانی کی حالت میں تھے ۔ اس نشست کیلئے عبدالرشید خان طاہر خیلی کو اپنا امیدوار کھڑا کر دیا۔ غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ مسلم لیگ نے بہ حیثیت جماعت اپنا امیدوار نامزد کر دیا۔ کانگرس کو اپنی طاقت پر بڑا ناز تھا سرمایہ کی اس کے پاس کمی نہ تھی۔ اور حکومت پر بھی اس کا قبضہ تھا کیونکہ ان دنوں صوبہ سرحد میں ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت تھی۔ یہ وزارت ۱۹۳۶ء کے انتخاب کے بعد صاحبزادہ عبدالقیوم خان کی وزارت کو شکست دیکر بنائی گئی تھی۔ اور اسی شکست کے فوراً بعد صاحبزادہ صاحب اس دارِ فانی سے چل بسے تھے۔ ان کی وفات کے بعد سردار اورنگ زیب خان مرحوم نے پہلی مرتبہ مسلم لیگ کا جھنڈا بلند کیا۔ اور کچھ مخلص لوگوں کی حمایت سے وہ میدان میں کود پڑے۔ اور اس ضمنی انتخاب میں مسلم لیگ کا امیدوار نامزد کر کے اس کی حمایت شروع کر دی۔ صوبہ سرحد کی اسمبلی کے انتخاب میں پہلی مرتبہ کانگرس اور مسلم لیگ کے مقابلہ پر سارے ہندوستان کے عوام کی نظریں جم گئیں۔ کانگرس کے بڑے بڑے لیڈروں نے یہاں آکر ڈیرے جما دیئے۔ اور ان کے مقابلے میں مولٰنا شوکت علی مرحوم اور دوسرے مسلم لیگی راہنما بھی یہاں آپہنچے۔ دونوں جماعتوں کے امیدواروں میں یہاں شدید مقابلہ ہوا۔ کانگرس نے اپنا سرکاری اور جماعتی دباؤ ڈالا۔ روپیہ پانی کی طرح بہا دیا۔ مگر تمام ہتھکنڈے استعمال کرنے کے باوجود کانگرسی امیدوار کو بری طرح شکست ہوئی۔ مسلم لیگ کی اس کامیابی پر ملک بھر میں مسلمانوں نے خوشی منائی۔ اور بڑے بڑے شہروں میں چراغاں کئے گئے۔ اس کامیابی پر پہلی مرتبہ ہندوستان کے مسلمانوں کو پتہ چلا کہ صوبہ سرحد کے مسلمان کانگرس کے ساتھ نہیں اور خان عبدالغفار خان کا یہ دعویٰ کہ وہ تمام سرحدی عوام کے لیڈر ہیں۔ حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔

اور مولٰنا ظفر علی خان فرماتے ہیں

جب جیت لیگ کی ہوئی اور کانگرس کی ہار — رُتی بھی سرپہ بڑ کے گورنمنٹ " خان " کی
گاندھی بھی رو رہے تھے یہ کہہ کر کہ ہائے ہائے! — سرحد میں ناک کٹ گئی ہندوستان کی
جتنی بھی دھوتیاں تھیں وہ سب ڈھیلی ہو گئیں — کیا بات ہے پٹھے ہوئے تہمد کی شان کی
شوکت علی کے جاتے ہی آیا اک انقلاب — رنگت معاً بدلنے لگی آسمان کی
میداں میں جم سکا نہ قدم سُرخ پوش کا — جس وقت سر پہ آئی گھڑی امتحان کی
اسلام نے ہزارہ میں اعلان کر دیا — فطرت کبھی بدل نہیں سکتی پٹھان کی
اُردو کو میں نے زندہ جاوید کر دیا — ہندوستاں میں دھوم ہے میری زبان کی

اہل ہزارہ کے اس فیصلے سے سرحد کے دوسرے اضلاع کے مسلمانوں میں بھی حوصلہ پیدا ہو گیا اور وہ بھی کھل کر مسلم لیگ کی حمایت کرنے لگے۔ درحقیقت حصول پاکستان کی جدوجہد میں اور جنگ آزادی میں یہ پہلا مورچہ تھا جو مسلم لیگ نے ہزارہ میں فتح کیا۔ اس کے بعد ملک کے حالات بدلتے رہے۔ قائداعظم کی پرخلوص قیادت میں زیادہ سے زیادہ لوگ مسلم لیگ کے قریب آنے لگے اور اس کے بعد قائداعظم نہایت جرأت سے یہ کہتے کہ ہندوؤں اور انگریزوں کے علاوہ ایک اور طاقت بھی ہے۔ اور وہ مسلمان ہیں۔ یہی طاقت مسلم لیگ کے رنگ میں عملی شکل اختیار کر گئی۔

یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ ۱۹۳۸ء میں ہفت روزہ "پاکستان" ڈاکٹر خان صاحب کی کانگرسی وزارت کی نظر بد سے نہ بچ سکا۔ کانگرس حکومت نے ضمانت ضبط کر لی اور اخبار بند کر دیا۔ یہ ہفت روزہ سید غلام حسن شاہ کاظمی (سکونتی زیارت ٹھنگر شریف مظفر آباد آزاد کشمیر) نے ۱۹۳۶ء میں ایبٹ آباد (ہزارہ) سے جاری کیا تھا۔ مدیر موصوف آغا لعل شاہ صاحب مرحوم سابق ایڈیٹر "زمیندار" لاہور کے بھتیجے اور داماد ہیں۔ کاظمی صاحب خداوندوں کی خوشامد نہ کر سکا۔ اور نہ حکومت کے درپرچہ سائی اور ناصیہ فرسائی کی رسوائی خریدی۔ واعظوں نے اسے رند مشرب خیال کیا۔ برہمن نے عدو ہے بتاں جانا اور پھر

پاکستان کا مبلغ اور "پاکستان" اخبار کا مدیر ؟ یہ کوئی تھوڑا جرم تھا؟ ۵

تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے ذوقِ جرم زیادہ سزا کے بعد

اس قسم کے واقعات کے باوجود مسلم لیگ کی مقبولیت دن بدن بڑھتی گئی۔ اور اسلامیانِ ہزارہ کو بھی تحریک پاکستان سے والہانہ وابستگی تھی۔ یہ کارواں بڑی سرعت سے منزل مقصود کی جانب رواں دواں تھا اسی سال آخر میں "آل انڈیا مسلم لیگ" کا چھبیسواں اجلاس ۲۶ دسمبر ۱۹۳۸ء بمقام بانکی پور شروع ہوا جس میں چالیس ہزار آدمی شریک ہوئے۔ اور تقریباً تین ہزار کے قریب پردہ نشین خواتین بھی شریک جلسہ تھیں اور خطبہ صدارت مسٹر عبدالعزیز بار ایٹ لاء صدر مجلس استقبالیہ آل انڈیا مسلم لیگ پٹنہ نے فرمایا۔ اور خطبہ صدارت کے بعد تجاویز پاس ہوئیں اور اس میں ایک یہ قرارداد بھی تھی۔ اور جس کا مفہوم یہ تھا کہ[1]

"برطانیہ اور امریکہ کے چند لوگوں کا خیال ہے کہ فلسطین کو یہودیوں کا ملک قرار دیا جائے لہذا اگر اس خیال کو عملی جامہ پہنایا گیا تو یہ کارروائی اسلامی دنیا میں ایک بدامنی، کھلبلی و کش مکش پیدا کر دے گی۔"

اس تجویز کی تحریک مولنا مظہر الدین (یوپی) نے کی اور رئیس الاحرار ابو المعارف مولنا محمد عرفان نے تائید کی۔ صاحب موصوف کی تائید کے باعث شاہ حسین میاں (بہار) پروفیسر عبدالستار خیری (یوپی) ابو سعید، مولنا عبدالحمید صاحب (یوپی) پروفیسر عنایت اللہ (پنجاب) سر سید رضا علی (بنگال) ملک عبدالخالق (سندھ) مولنا کرم علی (یوپی) نے اس کی حمایت کی اور اگر اس قرارداد پر بہ نظر عمیق غور کیا جائے۔ اور حال میں رباط میں "اسلامی ملکوں کے سربراہوں کی کانفرنس" منعقد ہوئی۔ اور اس میں جو قرارداد فلسطین کے متعلق پاس ہوئی

---

[1] ملاحظہ ہو "تاریخ مسلم لیگ" مرتبہ از اختر درخشاں دار الکتاب ممبئی ع ۱۱

ان ہر دو قرار دادوں کا ادعا و مفہوم ایک ہے۔ دور بین نگاہوں نے ان خطرات کو اس وقت بھانپ لیا تھا۔ جن سے فلسطین آج دو چار ہے۔

بہر کیف تحریک آزادی کی جدوجہد جاری تھی۔ کہ ۱۶ اپریل ۱۹۳۹ء کو تحریک آزادی کا نامور کارکن، عالم اسلام کی محبوب شخصیت، رئیس الاحرار، ابوالمعارف مولٰنا محمد عرفان اس دار فانی سے رحلت فرما گئے، تمام ہندوستان میں صف ماتم بچھ گئی۔ بمبئی سے ہزارہ تک ایک کہرام تھا۔ ملک بھر کے اخبارات کے کالم بھرپور تھے۔

آہ! مولٰینا ابوالمعارف محمد عرفان رحمۃ اللہ علیہ

یک داغ نیک نا شدہ داغ دگر رسید

آہ! ہمارے رئیس الاحرار باشندگان ہند کے پرخلوص راہنما اور ملت اسلامیہ کے مجاہد سردار (مولٰنا) ابوالمعارف محمد عرفان ہمیشہ کیلئے اس دنیائے فانی سے رحلت فرما گئے اور وہ بھی اس سرعت سے رخصت ہوئے کہ کسی کو بات تک کرنے کی مہلت نہ دی۔ ۱۶ اپریل دس بجے کے قریب حسب عادت شاداں ”ہندوستان خلافت ہاؤس“ سے رخصت ہوئے، مسلم لیگ کے دفتر میں جنرل بورڈ کا اجلاس ہو رہا تھا۔ اس میں شامل رہے کہ دفعتاً ان کے دل کے قریب درد محسوس ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد قے ہوئی، قریب ہی ایک دواخانے سے دوائی حاصل کی طبیعت زیادہ خراب نہ تھی۔ تاہم ان کے عزیز ترین دوست سیٹھ عثمان سبحانی نے انہیں مکان پر پہنچانے کا اہتمام کر دیا۔ چنانچہ اپنی موٹر میں لے کر ”خلافت ہاؤس“ آئے، مولٰنا کی طبیعت اس وقت خراب نہ تھی۔ جونہی امداد و سہارا لے کر موٹر سے اتر کر ”خلافت ہاؤس“ اپنے روم میں اوپر چڑھے اور ان سے کہا کہ آپ چارپائی تک پہنچا دیں۔ قدرے آرام کر لوں۔ اچانک چند ثانیئے ان کی طبیعت خراب ہو گئی اور قے کرنے کے لئے چارپائی سے اترے۔ اور تھوڑے ہی فاصلے پر قے کی

اور ان کے احباب بھی قریب ہی کھڑے تھے۔ اب قے کر کے اٹھے تو کمزور تھے عثمان صاحب اور جیلانی نے سہارا دے کر چارپائی تک پہنچانا چاہا۔ لیکن وہاں تک پہنچنے سے پہلے گر پڑے، دونوں صاحبان نے سنبھالا اور چارپائی پر لٹا دیا۔ لیٹتے ہی تنفس بدل گیا۔ اور ایک ہی سیکنڈ میں روح قالب سے پرواز کر گئی۔

یہ حالت دیکھ کر عثمان صاحب نے تین چار آدمیوں کو ڈاکٹر بلانے کیلئے بھیجا تھا۔ لیکن اتوار کے دن خدا کسی کو ڈاکٹر کی ضرورت نہ ڈالے۔ کوئی ڈاکٹر فوراً نہ ملا۔ پڑوسی ڈاکٹر نے اس وقت آ کر نبض دیکھی اور کہا۔ ہارٹ فیل ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ہ

حرکت قلب بند ہونے کا بہانہ ہو گیا اور وہ ہمیشہ کیلئے ہمیں داغ جدائی دے گئے۔ فرشتۂ اجل کسی کو چھوڑنے والا نہیں۔ موت کی لذت چکھنا ہمارا ایمان ہے۔ لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ کہ عالم کی موت عالم کی موت ہوا کرتی ہے۔ جرنیل کی موت فوج کی موت کے مترادف ہے۔ اور بادشاہ کی موت ملک کی موت کہا جاتا ہے۔ مرنے کو ہم سب ایک نہ ایک دن مر جائینگے۔ لیکن مولنا محمد عرفان کی موت سے تعارف وہ یہ کہ جنگ آزادی کا عظیم کارکن اور خلافت کا علمبردار دنیا سے اٹھ گیا۔ بلکہ پوری ملت کا محبوب باقی نہ رہا۔

ملتِ اسلامیہ کے اس محبوب راہنما کی موت پر چند کلمے لکھے جانے ضروری ہیں۔ "خلافت ہاؤس" میں بیٹھے اس انتھک کارکن کیلئے آنسو بہانے فطرتاً نا گزیر ہیں۔ لیکن دل میں اتنی طاقت، دماغ میں اتنی قوت اور ہاتھ میں اتنا زور باقی نہ رہا۔ کہ دردِ دل کو سفید کاغذ پر سرخ نقوش سے ظاہر کیا جا سکے۔

آہ! ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ابھی مولنا شوکت علیؒ کی وفات کا داغ ہر ساعت درد کی ٹیس پیدا کر رہا تھا۔ کہ اس پر عرفان کی جدائی نے اسے ایک اور چرکہ دیا۔ مسلمان جس طرح اپنے دوسرے زعماء کو روتے رہے وہ عمر عرفان کو بھی روتے رہیں گے۔ نہ ان کی آج تک کسی نے جگہ لی۔ اور نہ ان کی جگہ لینے والا کوئی نظر آتا ہے۔

مولنا محمد عرفان کی پیدائش صوبہ سرحد کے ضلع ہزارہ میں ہوئی آپ مانسہرہ شہر کے قریب موضع "پکھوال" کے رہنے والے تھے اور قوم تنولی سے تعلق تھا ملک کی فضا اور آزادی کی ہوا بچپن سے سر میں موجود تھی۔ ابتدائی تعلیم مانسہرہ اور ایبٹ آباد میں حاصل کرنے کے بعد حصول علم کیلئے ہندوستان کا رخ کیا۔ اس وقت آپ بہت ہی کم عمر تھے۔ لیکن جذبہ شوق نے انہیں علیگڑھ پہنچا دیا۔ وہاں آپ عرصہ تک تعلیم حاصل کرتے رہے۔ کچھ عرصہ بنارس میں قیام کیا۔ پھر دیوبند میں متعلم و معلم دونوں حیثیتوں سے دکھائی دیئے۔

قرآن، حدیث اور دیگر علوم میں وہ ملکہ حاصل کیا کہ بڑے بڑے علامہ برابری کا دعویٰ نہ کر سکے عربی بلا تکلف اور پوری فصاحت و بلاغت سے بولتے تھے اور اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے۔ کہ جب مصر گئے تو ایک جلسہ عام میں ایک جدید عربی زبان پر جو ان دنوں عالم اسلام میں رائج ہے۔ شدت سے نکتہ چینی کی۔ جس پر علمائے مصر محو حیرت تھے۔ اور انہوں نے کھلے اجلاس میں اعتراف کیا کہ مولنا محمد عرفان فصیح ترین عربی بولنے والوں میں شمار کئے جا سکتے ہیں

اسی طرح اردو زبان پر بھی وہ قدرت حاصل تھی کہ بریلی اور دہلی کے باشندوں کو آپ سے گفتگو میں خاص احتیاط برتنی پڑتی تھی۔ اور زبان کے سلسلے میں آپ کا فیصلہ ناقابل تردید ہوتا تھا۔

تکمیل تعلیم کے بعد آپ واپس صوبہ سرحد تشریف لائے جنگ یورپ کے اختتام کا زمانہ تھا سرحدی قبائل نے حکومت کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ مولنا محمد اسحق مانسہروی اور مولنا محمد عرفان کو حکومت نے مشکوک نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا۔ فوجی نمائش سے ۱۹۲۰ء میں آپ کو گرفتار کر کے بنارس جیل میں نظر بند کر دیا۔

وہاں سے الہ آباد بھیجے گئے۔ اسی طرح قریباً تین سال کا عرصہ قید و بند میں گزرا۔ تین سال کے بعد رہائی ملی۔ تو بھی صوبہ سرحد میں داخلہ بند رہا۔ اور آپ اپنے وطن عزیز کو نہ آ سکے۔ اس زمانہ میں تحریک خلافت زوروں پر تھی۔ آپ نے اس میں شمولیت کی۔ علماء میں بلند مرتبہ تو تھا ہی "جمعیت علمائے ہند" نے اپنے میں شامل کر لیا۔ اور جمعیت کا معتمد مالیات بنا دیا۔

اور اخبار "الجمعیۃ" آپ کی نگرانی میں شائع ہوتا رہا۔ ۱۹۲۷ء یا ۱۹۲۸ء میں جب "جمعیت علمائے ہند" کا سالانہ اجلاس پشاور میں ہوا۔ تو ہر سرحدی نے مولانا محمد عرفان کو اجلاس میں شامل دیکھنا چاہا۔ لیکن حکومت آمادہ نہ ہو سکی۔ بالآخر سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان کی کوشش سے جو مجلس استقبالیہ کے صدر تھے۔ آپ کو سرزمین سرحد پر قدم رکھنے کی اجازت ملی۔ اور وہ بھی صرف پانچ دن کیلئے اور ان پانچ میں ایک دن کیلئے گھر (ضلع ہزارہ) آنے کا ذکر تھا۔

سنہ میں آپ "امام الاحرار" مولانا محمد علی جوہر کے پیروکار تھے اور علی برادران اور ان کے خاندان سے اس قدر محبت تھی کہ اس خاندان کے ہی رکن سمجھے جاتے تھے حتیٰ کہ جب "خلافت ہاؤس" کے ٹرسٹ بنانے کا سوال ہوا۔ تو خود بیگم محمد علی نے ان کا نام اپنے خاندان کے رکن یا علی برادران کے بھائی کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔

جب جمعیت علمائے ہند اور مجلس خلافت میں سیاسی مسائل کی وجہ سے اختلاف پیدا ہوا۔ تو آپ نے "امام الاحرار" کی پیروی کو اپنے لئے مشعل راہ سمجھا اور تادم وفات اس پر عمل پیرا رہے۔ ۱۹۲۸ء میں آپ "مجلس خلافت" کے سیکرٹری منتخب ہوئے اور ۱۹۲۹ء سے ممبئی میں آکر مقیم ہوئے۔

"جمعیت علمائے ہند" اور "خلافت" کے پروگرام کی تکمیل کیلئے آپ نے ہندوستان کا کونہ کونہ چھان مارا۔ رنگون اور سنگاپور تک اس سلسلہ میں تشریف لے جا چکے تھے۔ عالم اسلام سے آپ کو خاص طور پر دلچسپی تھی۔ اور عالم اسلام کی سیاست کا جس قدر علم و واقفیت آپ کو حاصل تھی۔ شاید ہی ہندوستان کا کوئی اور راہنما آپ کی برابری کا دعویٰ کر سکے۔

دو دفعہ حجاز کا سفر کیا۔ اور بہت دن نہیں گزرے کہ آپ نے مجلس خلافت کے نمائندہ کی حیثیت سے "فلسطین کانفرنس" منعقدہ قاہرہ میں شمولیت کی۔

مصر کے بعد آپ نے فلسطین کی راہ لی۔ اور دنیا نے دیکھا کہ جہاں ایک طرف مجاہدین دشمنوں پر آگ کے گولے برسا رہے تھے۔ اور دوسری طرف گورا فوج کا ایک اشارہ ہر شخص

کی زندگی ختم کرنے کو کافی تھا۔ لیکن اس پُرخطر میدان کارزار میں وہ صرف مولنا محمد عرفان تھا جو تن تنہا موٹر ڈرائیور کے ساتھ مجاہدین تک پہنچا اور جب بیروت میں اپنی قابلیت سے حضرت "مفتی اعظم فلسطین" تک پہنچ کر شرف ملاقات حاصل کیا تو قبلہ مفتی صاحب نے فرمایا "کیا تو جن ہے؟ یہاں کیسے پہنچ گیا؟"

آپ نے اپنے سفر کے مختصر حالات "روزنامہ خلافت" میں لکھنے شروع کئے۔ لیکن افسوس! کہ وہ سلسلہ ناتمام رہ گیا اس پر جنوری سنہ ۱۹۳۹ء میں "آل انڈیا خلافت کمیٹی" کی مجلس انتظامیہ نے آپ سے خواہش کی کہ وہ اپنے ان مضامین کی روشنی میں پورا سفرنامہ مرتب کریں تاکہ دنیا کو علم ہوسکے کہ فلسطین کے عربوں پر کیا گذری ہے؟ لیکن افسوس! کہ اب یہ خواہش تاقیامت پوری نہ ہوسکے گی۔

مولنا شوکت علی مرحوم کے ہمراہ آپ نے افغانستان کا سفر کیا۔ وہاں کے حالات سے واقفیت حاصل کی۔ اور اب ارادہ کر رہے تھے کہ ایک دفعہ پھر فلسطین اور عالم اسلام کا دورہ کریں۔ آپ کی اس خواہش کے پیش نظر "یکم" کو جنوری سنہ ۱۹۳۹ء میں مرکزی مجلس خلافت میں سیکرٹری مقرر کیا گیا۔ اور "مولنا شوکت علی" کا اعزاز انہیں تفویض کیا گیا تاکہ وہ وفد کے قائد کی صورت میں پیش پیش ہوکر عالم اسلام کا دورہ کریں۔ لیکن افسوس! مولنا شوکت علی داغ مفارقت دے گئے۔ اور ابھی یہ زخم مندمل نہ ہوئے تھے۔ کہ اب مولنا ابوالمعارف محمد عرفان ہمیشہ کیلئے ہم سے جدا ہو گئے

"یک داغ نیک ناشدہ داغ دگر رسید"

جنگ آزادی کا نڈر سپاہی، ناموس رسولؐ کا پروانہ، خلافت کا علمبردار، اسلامی نظام کا طلبگار، رئیس الاحرار مولنا ابوالمعارف محمد عرفانؒ "سوناپور" بمبئی کے قریب قبرستان میں مدفون ہوا۔ ہندوستان بھر کے اخبارات ماتم کناں رہے چنانچہ ہفت روزہ "خلافت" بمبئی ۲۳ اپریل سنہ ۱۹۳۹ء میں "محشر امروہوی" کے منظوم کلام سے حضرت ابوالمعارف

مولانا محمد عرفان کی شخصیت کے متعلق اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کہ عوام الناس کے دلوں میں ان کی کس قدر قدر و منزلت تھی۔ اور آج ضلع ہزارہ کے اکثر افراد ان کے نام سے ناآشنا نظر آتے ہیں۔ ابو المعارف کا نعم البدل صدیوں تک ہزارہ میں پیدا نہ ہو گا۔

ے

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

نوٹ: مولانا ابو المعارف محمد عرفان کی وفات کے متعلق مؤرخین کی رائے میں تضاد ہے اللہ بخش یوسفی مصنف "سرحد اور جدوجہد آزادی" اور ضیاء الدین برنی مصنف "عظمتِ رفتہ" کی تحقیقات کے مطابق ۱۴ اپریل سنہ ۱۹۳۹ء ہے۔ برعکس اس کے رئیس احمد جعفری مصنف "دید و شنید" اور ڈاکٹر شیر بہادر پنی مصنف "تاریخ ہزارہ" کا ۱۷ مارچ سنہ ۱۹۳۹ء پر اتفاق ہے۔ لیکن ہفتہ وار "خلافت" بمبئی ۲۳ اپریل سنہ ۱۹۳۹ء میں مولانا موصوف کی تاریخ وفات ۱۶ اپریل سنہ ۱۹۳۹ء بتائی گئی ہے۔ راقم الحروف کی تحقیق کے مطابق ہفتہ وار "خلافت" بمبئی کی رائے حقیقت پر مبنی ہے۔ حالانکہ سید سلیمان ندوی مصنف "یادِ رفتگاں" نے ۱۶ مارچ سنہ ۱۹۳۹ء تاریخ وفات غلط روایت بیان کی ہے۔

آہ! مولینا عرفان

اس قدر جلد جدائی کا سبب جان گئے
ان کو شوکت نے بلایا تھا کہ عرفان گئے

اس قدر جلد زمانہ سے جو عرفان گئے
قوم نے بات نہ مانی تو برا مان گئے

جوہر و شوکت و اقبال و کمال و عرفان
سچے خادم تھے یہ سب قوم پہ قربان گئے

بات سچی ہے مگر کہنے سے شرماتا ہوں
ہیں مسلمان مگر صاحب ایمان گئے

اب نہ جوہر ہیں نہ شوکت ہیں نہ عرفان و کمال
ہائے اب سب قوم مسلمان کے نگہبان گئے

کیسے کیسے ہیں ملے خاک میں رہبر اپنے
کیسے کیسے دل بیتاب کے ارمان گئے

دل کو تھامے ہوئے بیٹھے ہیں خلافت والے
کیا کوئی اور خلافت کے نگہبان گئے

اب ہمیں دیکھ کے ہنستے ہو چڑاتے ہو ہمیں
دشمنو! راہ بتانے کے بھی احسان گئے

چل دئے خلد کو سب راہ بتانے والے
پہلے شوکت گئے اور بعد کو عرفان گئے

(محشر امروہوی)

(ماخوذ از ہفتہ وار "خلافت" بمبئی۔ ۲۳ر اپریل ۱۹۲۹ء)

حضرت مولٰنا ابوالمعارف محمد عرفان نے ایک خط حاجی علیگوہر خان رئیس تاتار (TATAR) کو لکھا۔ کہ تحریکِ خلافت ایک عبرت خیز روئداد ہے جسے میں مرتب کر رہا ہوں۔ لیکن افسوس! انکی زندگی نے ایفا نہ کیا۔ اور ان کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ خاکسار نے اس فریضہ کو انجام دینے کی خاطر سرانجام دینے کی خاطر "تحریکِ خلافت" کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ دوسری تحریکوں کا سرسری جائزہ لیا ہے اور شہدائے بالاکوٹ سے عقیدت کے باعث "تحریکِ مجاہدین" پر تبصرہ کرتے ہوئے "تحریکِ پاکستان" سے کڑیاں ملادیں۔ اور بعض واقعات کی نسبت اشارتاً ذکر کیا ہے۔ درحقیقت کتاب ہذا صرف "تحریکِ خلافت" کے چند پوشیدہ پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے متعلق لکھی ہے حضرت ابوالمعارف کا خط درج ذیل ہے۔

صدر دفتر شعبۂ تبلیغ و حفاظت اسلام جمعیت علماء دہلی

مورخہ ۹ محرم الحرام ۱۳۴۲ھ

ابوالمعارف محمد عرفان

ناظم تبلیغ جمعیۃ علمائے ہند

صدیقی الاکرم و جناب محترم دام مجدکم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

یقیناً ایک مدت دراز کے بعد آپ نے یاد فرما کر "اب بھی پوچھا تو مہربانی کی" کا عملی ثبوت بہم پہنچایا جس کا واقعی بیش از بیش افسوس ہے۔ کہ اس بے معنی سکوت اور بے نتیجہ جمود کا اس کے سوا اور کیا اثر ہوا کہ "تحریکِ خلافت" ضلع ہزارہ سے بالکل پامال ہو گئی اور خلافت کا نام لینا بھی ویسا ہی جرم ہو گیا جس طرح ڈکیتی اور قتل و غارتگری، اگر آپ حضرات اس سلسلے میں مراسلت ہی کا ادنیٰ سے تعلق کو قائم رکھتے تو میں سمجھتا ہوں کہ ضلع ہزارہ کی آج یہ کیفیت نہ ہوتی جسے آپ دیکھتے ہیں اور ایک ادنیٰ اجنبش اور حرکت نہیں کر سکتے

"سرزمین بے آئین" کے دوسرے حصے بھی اسی آنچ کے "بنجر آباد" میں جہاں استبداد اور تشدد کے دیوتاؤں کے ظالمانہ حکومت کا آہنی پنجہ گرفت کیلئے موجود ہے مگر اس کے ساتھ ہی ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان حصص کے اسلامی کارکنوں کے اعضاء وجوارح حرکت کرتے ہیں۔ ان کی زبانیں گویا ہیں۔ ان کے دماغ معروف غور وفکر ہیں۔ اور ان کی عملی قوتیں ظلم اور ناانصافی بے ایمانی اور جبرو تشدد سے اسی طرح برسرِ جنگ ہیں جس طرح آج سے دو تین سال قبل تھیں

"ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا"

میں تسلیم کرتا ہوں کہ ضلع ہزارہ سے "تحریک خلافت" کے انہدام اور انقطاع کی تمام تر ذمہ داری آپ حضرات پر رکھنا صریح بے انصافی اور ظلم ہے اس میں قطعاً دوسرے اکابر کی غلط کاریاں بھی شامل ہیں۔ بلکہ اس کا قوی سبب اور باعث ہیں یہ جنہیں تاریخ کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتی۔ اور نہ کبھی کسی مؤرخ کا قلم ان تکلیف دہ واقعات کو صفحۂ قرطاس پر ثبت کرکے لائیگا۔ کہ اعرابی جس کا راستہ پر چل کر مکہ پہنچنا چاہتا تھا وہ راستہ ترکستان جاتا تھا۔ تاہم میرا ایمانداری کے ساتھ خیال ہے کہ ۱۹۲۰ء کے غیر متوقع انقلاب کے بعد عام طور پر ضلع ہزارہ کے مسلمانوں کے دلوں سے خدا کا خوف اٹھ گیا تھا۔ اور انہوں نے توحید پرستی کی بجائے طواغیت اور اصنام باطلہ کو "نعوذ باللہ من ذالک" معبود خیال کر لیا تھا۔

کاش! کہ سارا ضلع ہزارہ گرفتار ہو جاتا تو دنیا کو معلوم ہو جاتا کہ استبداد کا آخری حشر کیا ہوا یقیناً وہی ہوتا جو اسلام کے محافظ کا امین پرستاروں سے اٹل وعدہ ہے

فقطع دابر القوم الذین ظلموا والحمد للہ رب العلمین ۝

مگر حریت اور آزادی کے مظاہروں کی بجائے چاروں طرف نالہ وبکا شور وشیون شروع ہو گیا۔ اور ہر شخص اس گرفتاری کو عذاب الٰہی سمجھ کر استغفار کرنے لگا۔ جس کا لازمی نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے۔

خیر یہ ایک طویل بحث ہے اور بجائے خود ایک عبرت خیز رُوداد ہے۔ جسے میں مرتب کر رہا ہوں۔ اگر زندگی ہوئی تو کبھی کتاب کی شکل میں ظاہر ہوگی۔ صرف آپ کو توجہ دلانے سے چند کلمات ضمناً بطور تذکرہ بقولے "مستاں را بسرو دیا دو بانند" عرض کروں۔ ورنہ مجھے کوئی تبصرہ کرنا مقصود نہیں۔

میں آپ کی مدت دراز کے بعد اس یاد دہانی کو بھی موجودہ اسلامی تعلقات اخوۃ اسلامی کی بگڑی ہوئی وابستگی کی تصویر اور ماحول کے انقلابات اور تغیرات پیدا کرنیوالے حوادث کے لحاظ سے غنیمت سمجھتا ہوں۔ ورنہ موسمی انقلابات کے دورِ حاضر میں آج پھر اسی تفرق اور تشتت، بیگانگی اور کس مپرسی کا گھر گھر رونا ہے جس کا مرثیہ آج سے چند سال قبل پڑھا جاتا تھا۔ اس لئے اگر ایسے جلد بدلنے والے حالات میں اخوۃ اسلامی کے ادنیٰ سے تعلق کا بھی کہیں سے پتہ لگ جائے تو اسے خدا کی نعمت کبریٰ سمجھنا چاہیئے۔

لہٰذا یاد آوری کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ نے خط کے دوسرے حصے میں لکھا ہے۔ کہ اگر کوئی موقعہ ہو تو مولانا محمد علی صاحب کے "ہمدرد" کے اسٹاف میں شامل ہونے کیلئے کوشش اور سعی کروں۔ جس میں شامل ہو کر کسی وقت ملک اور وطن کی خدمت اپنی لائنوں پر اپنا اخبار جاری کریں۔

یہ خیال علاوہ اس کے کہ مبارک داعیہ کا رہے۔ اس لئے بھی مبارک ہے کہ مجھے آپ کی معیت نصیب ہوتی۔ اور کم از کم ایک آزاد خیال دردمند ہمدردِ وطن سے تبادلۂ خیالات اور یکجائی کا موقعہ ملتا۔ مگر افسوس کے ساتھ اطلاع دیتا ہوں کہ اس سلسلے میں کامیابی بیحد مشکل ہے "ہمدرد" کی ایڈیٹری کیلئے مولانا نے سید جالب صاحب کو لکھنؤ سے بلایا ہے۔ جنکی ایڈیٹری میں پہلے بھی "ہمدرد" نکلتا تھا جو آج کل "ہمدم" نکال رہے ہیں۔ وہ مولانا کے شاگرد اور مخلص دوستوں میں ہونے کے ساتھ ایک تجربہ کار ایڈیٹر اور زبردست معلومات کے فاضل ہیں اس وقت ہندوستان میں ان سے بہتر کوئی شخص اربابِ صحافت میں موجود نہیں جو اس

فن میں عبارت کاملہ رکھتے ہیں۔ البتہ اردو زبان اور لوگ بھی ان سے بہتر لکھ سکتے ہیں۔ لیکن صحافت نگاری صرف زبان کا نام نہیں۔ زبان الگ چیز ہے۔ اور وقائع نگاری کا فلسفہ ایک جداگانہ حقیقت ہے۔

اس سلسلے میں میرے دو دوستوں نے (جو ان دنوں بی اے اور عربی کے فاضل ہیں اور "مدینہ" بجنور کے ایڈیٹر ہیں) میرے پاس درخواستیں بھیجیں کہ میں مولانا سے مل کر انہیں انکی خدمات کی طرف توجہ دلاؤں چنانچہ مولانا نے دونوں کے انگریزی تراجم کے نمونے منگوائے جن میں شبیر حسن صاحب کا ترجمہ آگیا ہے اور بدر الحسن صاحب کا ابھی نہیں آیا۔ سابق الذکر کے ترجمہ کو ملاحظہ کرکے مولانا نے فرمایا کہ "مجھے چھ چھ سال کے تو بہت ملے ہیں لیکن میں بارہ سال کا صرف ایک چاہتا ہوں۔" (یہ خط کشیدہ مولانا کے ہیں) اسی قسم کی اور سینکڑوں درخواستیں روزانہ موصول ہوتی ہیں۔ اور خود بھی لوگ آکر زبانی گفتگو کرتے ہیں۔ لیکن مولانا کا معیار نظر "ہمدرد" کیلئے یہ ہے کہ جو شخص انگریزی اخبارات اور پارلیمنٹ کے وزراء کی تقریروں کا صاف سلیس اور معنی خیز ترجمہ کرنے کے ساتھ چند اصول بتلانے کے بعد بہترین سیاسی خطوط میں لکھ سکے اس معیار کے لحاظ سے میرا خیال ہے کہ شاید بدر الحسن صاحب جلالی کامیاب ہو جائیں"

ابو المعارف محمد عرفان

عین اسی زمانہ میں جب۔ دیہاتی اور مزدور کار ہندوستانی روزگار اور رزق کی تلاش میں سرگرداں رہا اور دوسری طرف بدلتی ہوئی دنیا کے ساتھ غلامی اور افلاس کی زندگی کروٹیں بدل رہی تھی

نوشتہ ابو المعارف مولانا محمد عرفان کو ایک بین الاقوامی شخصیت کا مقام حاصل تھا ملاحظہ ہو کتاب "بیس بڑے مسلمان" مکتبہ رشیدیہ ۲۰۳۔اے شاہ عالم مارکیٹ لاہور

ملاحظہ ہو کتاب "مسئلہ حجاز" (رپورٹ مرتبہ سید سلیمان ندوی۔ شوکت علی۔ محمد علی شعیب قریشی) مطبوعہ خلافت پریس محلہ ڈونگری۔ بمبئی نمبر ۹

یکم ستمبر ۱۹۳۹ء میں جنگ عالمگیر شروع ہو گئی۔ اس نے زندگی کے دونوں شعبوں میں شعلہ کی بھڑک پیدا کر دی۔ اور کانگرس نے انگریزوں کو شدید مصیبت میں مبتلا دیکھ کر یہ خیال کیا کہ انگریزوں کو عدم تعاون کی دھمکی دیں۔ تاکہ وہ ہمارے سامنے جھکنے پر مجبور ہو جائیں۔ اور مرکزی حکومت پر ہمارا قبضہ ہو جائے۔ اور پھر ایک نئی دستور ساز اسمبلی بنا کر ایک اس طرح کا دستور وضع کر دیا جائے جو ہندوستان میں ویدک کلچر کو زندہ کر دے۔ یہ سوچ کر کانگرسی وزارتیں مستعفی ہو گئیں۔ انہیں امید تھی کہ دو ماہ کے اندر اندر انگریز گھٹنے ٹیک دینگے۔ اور ہم دوبارہ وزارتوں پر فائز ہو جائینگے۔

لیکن کانگرس نے اپنی قوت کا اندازہ غلط لگایا تھا۔ اس کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ اور ان چھ صوبوں میں انگریز نے ہنگامی حالات سے عہدہ برآ ہونے کیلئے صوبائی حکومتوں کو براہ راست گورنروں کے ماتحت کر دیا۔

ادھر صوبہ سرحد میں سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان وزارت بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ اور صوبہ سرحد کے پہلے وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ مرحوم خان بہادر سعد اللہ خان آف عمر زئی اور لالہ مہر چند کھنہ صوبائی کابینہ کے رکن مقرر ہوئے۔ صوبہ سرحد کے مشہور قانون دان ملک خدا بخش (مرحوم) صوبائی اسمبلی کے پہلے سپیکر منتخب ہوئے۔ لیکن وزارت کے معرض وجود میں آنے کے چند ماہ بعد ضلع ہزارہ کے سات ارکان اسمبلی ان سے ناراض ہو گئے۔ انہیں ایک تو ان کی پالیسی سے اختلاف تھا۔ اور دوئم سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان نے ضلع ہزارہ کو وزارت میں نمائندگی دینے سے انکار کر دیا تھا۔ جب سرحد اسمبلی کا موسم گرما کا اجلاس ۱۳ ستمبر ۱۹۳۷ء بمقام ایبٹ آباد منعقد ہوا۔ کانگرس اسمبلی پارٹی نے ڈاکٹر خان صاحب کی قیادت میں ضلع ہزارہ کے سات ممبران کو اپنے ساتھ ملا کر صاحبزادہ عبدالقیوم خان کی وزارت کیخلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کی۔ چنانچہ صوبہ کے گورنر نے ڈاکٹر خان صاحب کو وزارت بنانے کی دعوت دی۔ قاضی عطاء اللہ جان، خان محمد عباس خان اور دیوان بھجو رام گاندھی ڈاکٹر خان صاحب کی کابینہ کے رکن مقرر ہوئے۔ اور تقریباً تین سال تک ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت قائم رہی۔ لیکن ہے کہ یہ وزارت بھی اتنا عرصہ نہ چلتی۔ کیونکہ عدم اعتماد کی قرارداد کی منظوری کے بعد سر صاحبزادہ

عبدالقیوم خان انتقال کر گئے۔ ان کی جگہ سردار اورنگزیب خان پارٹی لیڈر مقرر ہوئے۔ وہ اس تاک میں تھے کہ ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت کو ختم کیا جائے۔ اتفاق سے دوسری عالمگیر جنگ چھڑ گئی اور کانگرس نے "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک چلائی۔ جس پر تمام کانگرسی وزراء جیلوں میں چلے گئے۔

صوبہ سرحد کی سرخ پوش تحریک کا بھی کانگرس سے الحاق تھا۔ اس لئے اس فیصلے کے تحت صوبہ سرحد کے وزراء بھی جیل چلے گئے۔

کانگرسی وزارتوں کے مستعفی ہو جانے کے بعد مسلمانوں اور اچھوتوں نے "یوم نجات" منایا کیونکہ کانگرس وزارتوں کے مظالم اور روح فرسا تکالیف ان کیلئے اذیت رساں دور کی یاد تھے۔ ہندوستان میں جلسے اور خدا کا شکر ادا کیا گیا اور اسلامیانِ ہند حصول مقصد کیلئے کوشاں رہے۔

جب "غلام آباد" ہند کے سیاسی افق پر آزادی کے آثار ہویدا ہوئے تو انگریزوں نے اس کارواں کے راستے میں خود ان کے خون کی ندی حائل کر دی۔ اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ "قرارداد پاکستان" جو ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو منٹو پارک کے وسیع میدان میں پاس ہوئی، خاکسار جانبازوں کے اسی خون کا صلہ تھی جو تین دن پہلے ۱۹ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور کے گلی کوچوں میں بہایا گیا۔ وجہ یہ کہ خاکسار تحریک کا عسکری نظام مذہب کے لازوال احکام و فرمان کی تعمیل تھا۔ خاکسار سپاہی حکومت کی پابندیوں کو "مداخلت فی الدین" سمجھ رہا تھا۔ اس کے جذبات میں ایک ہیجان فطری طور پر پیدا ہو رہا تھا۔ خوشحال خان جدون دسکوٹی نوانشہر ضلع ہزارہ کی ولولہ انگیز تقریروں نے اس ہیجان کو شعلوں کی مانند بھڑکایا، اور غیرت کی بجلیاں مجاہدوں کے دلوں میں کوندنے لگیں۔ قائد تحریک کی ہدایات کے بغیر تین سو تیرہ فرزندانِ توحید زیر قیادت خوشحال خان جدون نماز ظہر کی ادائیگی کیلئے کفن بردوش مارچ کر دیا۔ سیر اسندی

لہ لاہور میں ۱۷ مارچ ۱۹۴۰ء کو خاکسار افسران کی ایک مجلس مشاورت صورت حالات پر غور کرنے کیلئے منعقد ہوئی اور اس کے خاتمہ پر محمد شریف خان نائب حاکم اعلیٰ پنجاب، قائد تحریک حضرت

کے قریب پولیس نے جیش کو روک لیا۔ تلخ اور ترش گفتگو بڑھتی ہوئی لاٹھی چارج اور فائرنگ تک پہنچ گئی۔ ایک جانب خاکسار گولیوں سے چھلنی ہوئے۔ دوسری طرف مسٹر بیٹی ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس خاکساروں کے بیلچوں کا شکار ہوئے۔ گیلنسفورڈ سپرنٹنڈنٹ پولیس اور مسٹر بورن ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بھی زخمی ہوئے۔ اور دنیائے خاکسار پر ظلم و ستم کی قیامت ٹوٹ پڑی۔ اور نہایت بیدردی سے خاکساروں کو ختم کیا گیا۔ ولایت حسین اور ضیغم جیسے مایۂ ناز مجاہدین اسلام فائرنگ کی سنسناتی گولیوں کا شکار ہوئے۔ اور علامہ المشرقی کا آٹھ سالہ فرزند بھی مارا گیا۔ الغرض گلشن خاکساریت کے مسکراتے ہوئے اور مہکتے ہوئے پھول دستِ جفا شعار نے مل کر رکھ دیئے ؎

بیلچہ کاندھے پہ رکھے سر ہتھیلی پر لئے	قوتِ باطل سے ٹکرانے کو نکلے خاکسار
اپنے خوں سے کر گئے رنگیں خاکِ شہر کو	ان کی قربانی رہے گی آبدار و تابدار

(ذوالفقار انبالوی)

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱۶ سے آگے:۔

علامہ المشرقی سے احکام حاصل کرنے کے لئے دہلی روانہ ہو گئے کہ فیصلہ ہوا کہ محترم موصوف کی واپسی تک تمام اقدامات ملتوی کر دیے جائیں۔ محمد شریف خان کی عدم حاضری میں کمان کسی نہ کسی طرح خوشحال خان جدون سکونتی نواں شہر تحصیل ایبٹ آباد ضلع ہزارہ کے ہاتھ آ گئی اور تحریک کے ذمہ دار افسران کے لاہور میں ہوتے ہوئے انہیں یہ ذمہ داری محمد شریف خان سے ذاتی تعلقات کی بنا پر ملی یا کسی اور ذریعہ سے۔ بہر صورت حیران کن ضرور ہے۔ خاکسار تحریک کے سرگرم کارکن محمد اکرم خان ترین برادر حقیقی فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی روایت ہے کہ خوشحال خان جدون نے فرزندانِ توحید کو آتش نوائی سے بھڑکا دیا تھا۔ اور فی البدیہہ ذیل اشعار بھی پڑھے تھے

؎

سرِ راہِ شہادت سر بلندوں نے صفیں باندھیں	خدا کا حق ادا کرنے کو بندوں نے صفیں باندھیں
یہ پہلا جیش ہے انڈیا میں افواجِ الٰہی کا	تمہیں اعلان کرنا ہے خدا کی بادشاہی کا (صفحہ ۲۱۸ پر)

مسلم لیگ اس دور میں علامہ اقبال کے تخیل کو حقیقت میں ڈھالنا چاہتی تھی۔ اور اس مردِ درویش کے اس بلند پایہ تخیل کو عملی جامہ پہنانے کی سعیٔ بلیغ کر رہی تھی جب کل ہندوستان مسلم لیگ کا اجلاس ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں قائد اعظم کی صدارت میں منعقد ہوا تو انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا:۔

"ہم مسلمان چاہتے ہیں کہ آزاد قوم بن کر اپنے ہمسایوں کے ساتھ امن و امان کی زندگی بسر کریں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری قوم اپنی روحانی، تمدنی، اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی زندگی کو کامل نشو و نما بخشے اور اس کیلئے وہ طرزِ عمل اختیار کرے، جو اس کے نزدیک بہترین ہو جو ہماری قوم کے مذاق اور اس کے افراد کی امنگوں کے مطابق ہو۔"

اس کھلے اجلاس میں تمام مسلم نمائندوں نے تقسیم ملک کا مطالبہ کر دیا۔ یہ تجویز حسب ذیل الفاظ میں منظور کی گئی:۔

"کل ہند مسلم لیگ کا یہ اجلاس دستوری معاملات کی نسبت مسلم لیگ کونسل اور مجلس عاملہ

بقیہ نوٹ صفحہ ۲۱۷ سے آگے

یہی اک جیش دنیا میں انوکھا ہے نرالا ہے	فقط اس جیش کا سالار کالی کملی والا ہے

اور یہ روایت بھی بیان کی ہے کہ منظم شہید کمیٹی متعلق اللہ دتا خاکسار سکونتی جلالپور جٹاں پنجاب نے ذیل اشعار لکھے تھے

آیا تھا ترے گھر میں اک انجان مسافر	مہمان تھا، مہمان تھا، مہمان مسافر
سینے میں جگر رکھتا تھا انسان کا جگر تھا	انسان تھا، انسان تھا، انسان مسافر
سینے میں دبا کر تری فولاد کی گولی	سجدے میں گرا صاحب ایمان مسافر
قاتل نے تو دل کھول کے ارمان نکالے	اب کون نکالے ترے ارمان مسافر
اللہ کا صد شکر کوئی غیر نہیں تھا	جلاد مسلمان، مسلمان مسافر

اسی جیش میں علامہ عنایت اللہ خان المشرقی کا آٹھ سالہ فرزند احسان اللہ اسلم بھی شہید ہوا تھا۔ ۵

فنا ہو کر ملی اسلم حیات جاوداں تجھکو	پیام زندگی لائی یہ مرگ ناگہاں تجھکو

کی کارروائی کی تجاویز مورخہ ۲۷ اگست، ۱۷، ۱۸ ستمبر اور ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۹ء اور ۳ فروری ۱۹۴۰ء کی توثیق کرتے ہوئے پوری شدت کے ساتھ اس امر کا اعادہ کرتا ہے کہ وفاقی سکیم جس کی دستور ہند ۱۹۳۵ء میں تشریح کی گئی، اس ملک کے حالات کے اعتبار سے قطعاً ناموزوں ناقابل عمل ہے۔ اور مسلم ہندوستان کیلئے کسی طرح بھی قابل قبول نہیں

۲۔ ملک معظم کی حکومت کی طرف سے وائسرائے ہند کے اعلان مورخہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۹ء یہ اجلاس اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کرتا ہے کہ حکومت کے دستور ۱۹۳۵ء کا جہاں تک تعلق ہے اس اعلان کے ذریعہ یقین دلاتا ہے کہ مختلف فرقوں سے مشورات کے بغیر دستور پر نظر ثانی نہ کی جائیگی۔ لیکن مسلم ہندوستان اس وقت تک مطمئن نہ ہو سکیگا جب تک پورے دستوری خاکے پر از سر نو غور نہ کیا جائے، اور تاوقتیکہ اس کی بابت مسلمانوں کی رضامندی اور توثیق حاصل نہ ہو کوئی غور کردہ خاکہ قبول نہیں ہو سکتا

۳۔ کل ہندوستان مسلم لیگ کے اجلاس کی غور کردہ یہ رائے ہے کہ کوئی دستوری خاکہ اس ملک میں قابل عمل یا مسلمانوں کیلئے قابل قبول نہ ہوگا جب تک وہ مندرجہ ذیل بنیادی اصولوں کے تحت مرتب نہ کیا گیا ہو۔

جغرافیائی حیثیت سے متصل ارضی وحدتوں کے مابین حدود قائم کرکے ان کے جداگانہ علاقوں میں منقسم کر دیا گیا لیکن جیسا کہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ان رقبہ جات میں جہاں بلحاظ تعداد مسلمان اکثریت میں ہیں مثلاً شمال مغربی اور ہندوستان کے مشرقی علاقوں کو آزاد ریاستوں کی حیثیت سے ایک دوسرے سے اس طرح متحد کرنا چاہئے کہ ان میں سے ہر ایک وحدت خودمختار ہو۔

ان آزاد علاقوں اور خودمختار وحدتوں کے دستور میں اقلیتوں اور ان کے مذہبی، ثقافتی، معاشی، سیاسی، انتظامی و دیگر حقوق و مفادات کیلئے ان ہی کے مشورات سے معین و مؤثر تحفظات مہیا کرنے چاہئیں۔ ہندوستان کے دیگر علاقوں میں جہاں مسلمان

اقلیت میں ہیں وہاں دستور میں ان کیلئے معین و مؤثر تحفظات شامل کئے جائیں تاکہ ان کی مذہبی، ثقافتی، اقتصادی، سیاسی، انتظامی اور دیگر حقوق و مفادات کی فردانی کی مشورات کے ذریعے حفاظت ہو سکے

یہ اجلاس مجلس عاملہ کو اختیار دیتا ہے کہ مذکورہ صدر بنیادی اصول کے بموجب دستوری سکیم مرتب جس میں ان مختلف مجوزہ ریاستوں کے سارے مسائل مثلاً دفاع خارجی معاملات، رسل و رسائل جنگل و دیگر اہم امور کا اختیار ہو گا۔

انعقاد اجلاس لاہور سے پہلے اگرچہ علیحدہ وطن کا تصور موجود تھا۔ اسی نظریہ کو ہندو مسلم کشمکش کا خاتمہ کرنے کیلئے ایک بہترین حل سمجھا جاتا تھا لیکن اس نظریئے کو مسلم لیگ نے ابھی تک عملی صورت نہ دی تھی مگر مسلمانوں کے قائد نے انہیں بتا دیا کہ وہ ایک علیحدہ قوم ہیں، جسے علیحدہ وطن کی ضرورت ہے۔

جب مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کے اجلاس لاہور میں تقسیم ملک کی ایک باقاعدہ تجویز منظور کر کے اسے آخری مطالبہ کی صورت دیکر اپنی منزل متعین کر لی تو کانگرس اور مہاسبھائی حلقوں میں صف ماتم بچھ گئی۔ اور انہوں نے جس طرح اس تجویز کا خیر مقدم کیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ ایک ہزار سال تک زندگی گزارنے کے بھی ان کی ذہنی کیفیت و جذبات سے قطعی ناواقف تھے ان کے سنجیدہ راہنما بھی غیظ و غضب کا اظہار کر رہے تھے۔

ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں میں ایک نئی روح پیدا ہو گئی۔ اور قائد اعظم کی عظمت ان کے دلوں میں اور زیادہ ہو گئی۔ مسلمانوں نے ۱۹ اپریل سنہ ۱۹۴۰ء بروز جمعہ سارے ہندوستان میں اس تجویز کی تائید کی۔ اور اپنے عقیدہ کو دہرایا کہ مسلمان اس ملک میں ایک مستقل قوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور کسی دوسری قومیت کے جزو بن کر زندگی بسر کرنے کو تیار نہیں۔

دہلی میں "تجویز لاہور" کی تائید اور پاکستان کے حصول کیلئے پر زور جدو جہد رکھنے کیلئے "ایک پاکستان کانفرنس" ۸، ۹، ۱۰ جون سنہ ۱۹۴۰ء کو منعقد ہوئی۔ گاندھی جی مسلمانوں کو جھکانے میں ناکام ہو گئے

تو انہوں نے انفرادی سول نافرمانی کی تحریک جاری کی، تاکہ انگریز مسلمانوں کو نظر انداز کر کے ان سے معاملہ کرلیں۔ کچھ لوگ جنگ کے نعرے لگاتے ہوئے جیلوں میں چلے گئے۔ ؎

موت ٹل سکتی ہے پاکستان ٹل سکتا نہیں

سہ و سال کی گردشوں کے ساتھ ساتھ "اسلامی ریاست" اور اس کے ساتھ ساتھ والہانہ عقیدت دن بدن بڑھتی گئی، چنانچہ "اسلامی ریاست کی تشکیل کیلئے واضح نقشہ تیار کرنے کیلئے مسلم لیگ نے سنہ ۱۹۴۰ء میں علماء کی ایک کمیٹی قائم کی۔ مولانا عبد الماجد دریا آبادی لکھتے ہیں کہ :-

"ارباب لیگ کو خیال پیدا ہوا کہ جس اسلامی حکومت کا مطالبہ شد و مد سے کیا جا رہا ہے۔ خود اس کا نظام نامہ یا قانونی اساس بھی تو خالص اسلامی ہونا چاہیئے۔ اس غرض سے یو۔پی کے صوبہ میں مسلم لیگ نے ایک چھوٹی سی مجلس ایسے ارکان کی مقرر کی جو اس کے خیال میں شریعت کے ماہرین تھے، تاکہ یہ مجلس ایسا نظام نامہ مرتب کر کے لیگ کے سامنے پیش کرے اس مجلس نظام اسلامی کے ممبروں کے اسمائے گرامی ذیل ہیں :-

مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی، مولانا آزاد سبحانی، مولانا عبد الماجد دریا آبادی، مولانا ظفر احمد انصاری اور مولانا عبد الحامد بدایونی ۔۔۔"

جب ۲۳ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے جلسے میں "قرارداد پاکستان" منظور ہوئی یہ قرارداد بنگال کے عوامی راہنما فضل الحق نے پیش کی تھی۔ یہ قرارداد بظاہر چند الفاظ کا مجموعہ تھی لیکن بارود کا دھماکہ ثابت ہوئی، جس نے ہندوؤں کی سازشوں سے تنے ہوئے جال کو راکھ کا ڈھیر کر دیا اور ان کے تمام منصوبوں کو خس و خاشاک میں ملا دیا۔ ہندو اخبارات نے مخالفت شروع کر دی، وطنیت کے فریب میں آئے ہوئے علماء مدمقابل سینہ سپر ہو گئے۔ انہوں نے ساز باز کا ایک طویل سلسلہ شروع کر کے باقاعدہ دورے کئے، چنانچہ اسی سلسلہ میں مولانا ابو الحسنات قادری نے "جمعیت العلماء سنی" کی بنیاد رکھی، مولانا عبد الماجد دریا آبادی، لسان الامت نواب بہادر یار جنگ[1]، مولانا اشرف علی تھانوی اور ان کے

---

[1] نواب بہادر یار جنگ ۲۵ جون سنہ ۱۹۴۴ء کو فوت ہوئے۔

ساتھیوں نے مسموم ذہنوں کو جواب دینے کیلئے "متحدہ محاذ" قائم کیا مولانا ظفر احمد انصاری[1] نے فکر و دانش کی دنیا میں ایک عظیم انقلاب برپا کیا انگریز سامراج کے مکروہ چہرے بے نقاب کئے دین محمدیﷺ کی جھلملاتی شمع کو خورشید تاباں کا نور عطا کیا، اور حجۃ الاسلام حضرت شیخ القرآن مولانا عبدالغفور ہزاروی نے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا۔ ملک کے کونے کونے میں تقاریر کیں، اور مسلمانوں کے دلوں میں آزادی کی آگ بھڑکا دی، اور غلامی کی زنجیروں کو توڑا۔ اور باطل افکار کے تار و پود بکھیرے، اور مصنوعی عظمت کو زمین بوس کر دیا جس سے باطل کی تمام تاریکیاں چھٹنے لگیں، ان کے سینے میں ایمان و عرفان کا ایسا نور بخشا تھا۔ لا مذہبیت کے جتنے فتنے اس دور میں پھیلائے گئے تھے سب نیست و نابود ہو گئے، اور دین حق کے مخالفین اپنی کمین گاہوں میں چھپ گئے حضرت شیخ القرآن علامہ عبدالغفور ہزاروی کا انداز فکر منفرد و ممتاز تھا، خداوند تعالیٰ نے آپ کی زبان میں ایسی قوتیں عطا کی تھیں جن کی سحر کاریوں نے اس عہد کے دانشوروں اور رب نظر عالموں کو مبہوت کر دیا تھا۔ ادب ہو یا فقہ، فلسفہ ہو یا منطق، صرف ہو یا نحو یا تفسیر، میقات ہو یا ریاضی، غرض علوم ظاہری ہوں یا باطنی آپ کو سب پر یکساں قدرت حاصل تھی، یہ مرد مومن ایک عظیم مجاہد، اسلام کا جانباز اور نڈر سپاہی بن کر میدان میں کودا، اس کے سینے میں ایمان کا چراغ روشن تھا، اسے نصرت الٰہی کا سہارا حاصل تھا، اس کو علم و عمل کی عظیم قوت ملی تھی، اس لئے وہ باطل کے خلاف مسلسل جہاد میں مصروف رہا، اس مرد مجاہد، لسان العصر حضرت شیخ القرآن نے یہ دعویٰ کیا کہ اسلام ہی انسانی نجات کا ذریعہ اور اسلام ہی فلاح و کامرانی کا وسیلہ ہے، آپ نے حضرت قائد اعظم محمد علی جناح، سردار عبدالرب نشتر اور لسان الامت نواب بہادر یار جنگ سے مل کر بیک زبان نعرہ لگایا، ہم مسلمان ہیں، ہمارا مذہب اسلام ہے اسلام پاک ہے، اور پاکستان میں اسلام ہی قائم ہوگا، شیخ القرآن عبدالغفور ہزاروی نے

---

[1] مولانا ظفر احمد انصاری آل انڈیا مسلم لیگ کے جائنٹ سیکرٹری رہے ہیں۔

اسلام کے دشمنوں کو اپنی علمی بلندی اور فکری ذہانت سے شکست دی۔ اس دور میں انگریز و ہندو مت کے مکروہ افکار عروج پر تھے۔ کہ اس کے سامنے کوئی چراغ نہ جل سکتا تھا۔ آپ کی مساعیٔ جمیلہ سے متاثر ہو کر مولانا ظفر علی خان مدیر و مالک روزنامہ "زمیندار" لاہور نے فرمایا تھا۔ ؎

چشمہ ابل رہا ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کا

میں آج سے مرید ہوں عبد الغفور کا

تحریک آزادی کے نڈر سپاہی، باطل شکن مجاہد، علامہ عبد الغفور ہزاروی نے "وطنیت" کے بت کو پاش پاش کیا۔ آپ کا یہ روشن کارنامہ تھا۔ جس سے آپ کی شہرت کو فروغ ملا۔ یہ ملتِ اسلامیہ پر آپ کا عظیم احسان تھا۔ آپ کی ان مساعی سے مسلمانوں کے دلوں میں اخلاق و عقاید کی کمزوریاں دور ہو گئیں۔ اور تحریکِ پاکستان کا "کاروان" بڑی سرعت کے ساتھ اپنی منزل کی جانب بڑھ رہا تھا۔ تحریک پاکستان اب فیصلہ کن مراحل تک پہنچ چکی تھی۔ اور پورے ملک سے اس کی تائید میں آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس تحریک میں نمایاں کردار علیگڑھ کے طلباء نے سرانجام دیا۔ یا یوں سمجھیے! اس تحریک کا محور و مرکز علیگڑھ کے طلباء ہی تھے۔ جنہوں نے آزادی وطن کے لئے بے پناہ قربانیاں دیں۔ اور تحریک پاکستان کو بام عروج تک پہنچایا۔ ضلع ہزارہ کے جواں سال طالب علم اور یونیورسٹی ٹریننگ کور (U.T.C) کے سرگرم کارکن محمد انور خان (رئیس تاتار) کو حضرت قائد اعظم

ے شیخ القرآن علامہ عبد الغفور ہزاروی ۱۸۹۰ء اور دوسری روایت کے مطابق ۱۹۰۱ء میں موضع چمبہ تحصیل ہری پور ضلع ہزارہ میں پیدا ہوئے اور ۹ اکتوبر ۱۹۷۰ء سے وزیر آباد (پنجاب) میں محو خواب ہیں۔

ے علیگڑھ یونیورسٹی ٹریننگ کور کے سرگرم کارکن محمد انور خان ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۳ء تک رہے ہیں۔ مگر افسوس کا مقام ہے۔ کہ آنے والے ادوار میں محمد انور خان اپنی پدری روایات کو برقرار نہ رکھ سکے۔

محمد علی جناح نے اپنا باڈی گارڈ منتخب کیا اور بحیثیت باڈی گارڈ اس نے حضرت قائداعظم اور لیاقت علی خان کے ہمراہ صوبجات یوپی اور سی پی کا دورہ کیا اور ایک دور افتادہ اور پسماندہ ضلع کے طالب علم کیلئے یہ اعزاز معمولی نہیں ہے۔ اور وہاں طالبعلمی کے ایام میں فدا محمد حسان (ایڈوکیٹ) پشاور نے بھی تحریک پاکستان کیلئے اہم کردار ادا کیا ہے اور ارباب سکندر خان خلیل (ایڈوکیٹ) پشاور کی مساعی جمیلہ سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اسی بنجر آباد (ہزارہ) کے قابل فخر نوجوان مفتی محمد ادریس[لے] (ایڈوکیٹ) ہزارہ نے رہی سہی کمی پوری کر دی۔ صوبہ بہار میں مسلم نسل کشی کے دوران آپ نے مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں امدادی مراکز قائم کئے اور طلباء کے وفود کی قیادت کر کے پٹنہ پہنچے جہاں صوبہ بہار کے مختلف دیہات میں جا کر اپنی اور رفقاء کی زندگیاں خطرہ میں ڈال کر خانماں برباد مسلمان بھائیوں اور خواتین کی امداد کی۔ تحریک پاکستان کے سلسلہ میں ہندوستان کے مختلف صوبجات میں علیگڑھ کے طلباء کے وفود کی قیادت کی۔ یہ وہ طلباء تھے جو حضرت قائداعظم کے الفاظ میں

"ملت کی تقدیر کے ستارے تھے"

مفتی محمد ادریس کی خدمات کو تاریخ فراموش نہیں کر سکتی۔ اور علیگڑھ کی سرزمین سے ہزارہ کے گہرے مراسم ہیں کہ "تحریک پاکستان" کی آبیاری کیلئے اس نے اپنا حق ادا کیا ہے۔

اب ہم سرحدی حالات کا جائزہ لیتے ہیں کہ ۵ مئی ۱۹۴۳ء میں سردار اورنگزیب خان مرحوم نے اپنی وزارت مرتب کی۔ یہ صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کی پہلی وزارت تھی۔ سردار صاحب موصوف کی کابینہ میں سردار عبدالرب نشتر، خان ثمین جان خان، راجہ عبدالرحمٰن خان (نگری توتیال) ہزارہ اور سردار جیت سنگھ وزیر مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۵ء میں جب کانگرس نے دوبارہ وزارتیں بنانے کا فیصلہ کیا تو ڈاکٹر خان صاحب نے سردار اورنگزیب خان کی وزارت کیخلاف عدم اعتماد کا ووٹ

لے مفتی محمد ادریس نے ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۷ء تک تحریک پاکستان کے لئے کام کیا ہے۔ آپ ایم۔ اے ایل ایل۔ بی گولڈ میڈلسٹ علیگڑھ ہیں۔

منظور کر کے دوبارہ اپنی وزارت مرتب کر لی۔

تحریکِ پاکستان زوروں پر تھی۔ ۱۹۴۵ء میں مسلم لیگ نئے "پاکستان" کو بنیاد بنا کر انتخاب میں حصہ لینے کا آغاز کر دیا۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ نے کانگرس کے حق میں فتویٰ جاری کیا۔ مفتی محمد شفیع اور مولانا شبیر احمد عثمانی اپنے دوسرے اکابر کے ساتھ اس فتویٰ سے اختلاف کی بناء پر دیوبند سے الگ ہو گئے۔ مولانا ظفر احمد عثمانی بھی مولانا مدنیؒ کے مقابل آ گئے۔ چنانچہ جمعیت العلماء اسلام کی بنیاد کلکتہ میں پانچ سو متقدر علماء نے رکھی۔ جمعیت نے حصولِ پاکستان کیلئے مولانا شبیر احمد عثمانی کی زیرِ قیادت جدوجہد شروع کر دی۔ پاکستان کی حمایت میں مفت لٹریچر تقسیم کیا گیا۔ ملک کے کونے کونے میں "اسلامی ریاست" کی آواز پہنچانے کیلئے دورے کئے گئے۔ مشائخ کرام بھی میدان میں آ گئے۔ مقابلہ دن بدن سخت ہوتا جا رہا تھا۔ اکتوبر ۱۹۴۵ء میں پیر مانکی شریف کی دعوت پر مشائخ کرام کا عظیم الشان جلسہ ہوا۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ کے سجادہ نشین خواجہ حسن نظامی، پیر جماعت علی شاہ، پیر فضل شاہ، پیر عثمان علی شاہ، وغیرہ نے اپنے مریدوں کو "اسلامی ریاست" کے قیام کیلئے کام کرنے کا حکم دیا۔

ان دنوں میاں بشیر احمد ایڈیٹر "ہمایوں" کی شہرۂ آفاق نظم کا چرچا تھا اور ہر خاص و عام کی زبان پر ان کے اشعار تھے جس کے چند اشعار ذیل ہیں :-

ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح — ملت ہے جسم جاں ہے محمد علی جناح
ملت ہوئی ہے زندہ پھر اس کی پکار سے — تکبیر کی اذاں ہے محمد علی جناح
اے قوم! اپنے قائدِ اعظم کی قدر کر — اسلام کا نشاں ہے محمد علی جناح
عمر دراز بلائے مسلماں کی ہے دعا — ملت کا ترجماں ہے محمد علی جناح

اب ملک کے ہر حصے میں علماء اور مشائخ کرام اپنے ساتھیوں اور مریدوں کے ساتھ مسلم لیگ کے محاذ پر تن دہی سے کام کر رہے تھے۔ ۹ فروری ۱۹۴۶ء میں انتخاب ہوئے۔ ہزارہ میں سوائے ایک کانگرس جماعت کے ممبر عبد القیوم خان صواتی (رئیس سفیدہ) کے باقی سب مسلم لیگی ممبران کامیاب ہوئے۔

۱۔ محمد عباس خان سم الہٰی منگ ۲۔ حاجی علی گوہر خان سکنہ تاتار

۳۔ محمد فرید خان سکنہ بیڑ ۴۔ خانبہادر جلال الدین خان[1] ایبٹ آباد

۵۔ سردار بہادر خان سکنہ ریحانہ ۶۔ راجہ سردار خان نگری توٹیال

۷۔ خانبہادر محمد زمان خان کھلابٹ ۸۔ سلطان حسن علی خان سکنہ بوئی

۹۔ ملک میرداد خان سکنہ منگ (کوٹ نجیب اللہ)

سنہ ۱۹۴۶ء کے انتخاب میں کانگرس پارٹی کو اکثریت حاصل ہو گئی۔ اور ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت قائم رہی۔ اس دوران خان سردار بہادر خان صوبائی اسمبلی کے سپیکر رہے۔ اور سر اولف کیرو صوبہ سرحد کے گورنر رہے اس اسمبلی میں سترہ مسلم لیگی ممبر تھے جن میں دو بنوں، دو ڈیرہ اسمٰعیل خان ایک پشاور ایک مردان اور دو بڑے زمیندار صوبہ سے جن میں ایک ہزارہ اور باقی نو ہزارہ کے کل دس ممبر مسلم لیگ میں شامل تھے مسلم لیگ مخالف بنچوں پر تھی مسلم لیگ نے عبد القیوم خان بیرسٹر کو لیڈر مقرر کیا۔[2] اور حبیب اللہ خان (بنوں) کو ڈپٹی لیڈر اور خان سردار بہادر خان کو سیکرٹری چنا گیا۔ اچانک یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس ضلع سے کانگرس کا ممبر کس طرح کامیاب ہوا۔ درحقیقت وہ عبد القیوم خان صواتی کی ذاتی شخصیت تھی۔ پوری کانگرس جماعت میں ان کے کردار کی مثال مشکل سے ملیگی۔ دوست اور دشمن آپ کے کردار اور اوصاف کے معترف تھے آج بھی برصغیر کے سیاسی حلقوں میں ان کا نام فرطِ عقیدت سے لیا جاتا ہے۔ جب آپ سنہ ۱۹۲۱ء میں خلافت کمیٹی پشاور کے سکرٹری کے فرائض انجام دے رہے تھے کہ گرفتار ہوئے اور تین سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ ان کو

---

[1] جب آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس منعقدہ سنہ ۱۹۴۶ء بمقام بمبئی فیصلہ کیا گیا کہ انگریزوں کے عطا کئے ہوئے خطاب اور جاگیریں واپس کر دی جائیں۔ قائداعظم کے اس حکم پر متحدہ ہندوستان میں سب سے پہلے خطاب واپس کرنیکا اعلان ضلع ہزارہ کے قابل تنظیم راہنما خان بہادر جلال الدین المعروف جلال بابا نے کیا۔ جو اب تاریخ کا ایک سنہری باب ہے

[2] صفحہ ۲۲۷ پر۔

سنٹرل جیل میں رکھا ان کے بڑے بھائی غلام رسول خان صواتی ملک خدابخش مرحوم سابق جوڈیشل کمشنر سرحد، محمد جان خان بیرسٹر ساکن بنوں اور دیگر علمائے خلافت تحریک بھی قید تھے استقامت سے قید گذاری ۱۹۲۴ء یا اوائل ۱۹۲۵ء میں رہا ہوئے اور تمام زندگی اصولوں کی خاطر صعوبتیں برداشت کرتے رہے لیکن صداقت کا دامن نہ چھوڑا جب ایل ایل بی کیلئے علیگڑھ گئے وہاں بھی سیاسی سرگرمیاں جاری رہیں آپ ۱۹۲۷ء تا ۱۹۴۳ء ترک موالات کانگرس کمیٹی کے سیکرٹری رہے پہلی بار ۱۹۳۲-۳۳ء میں سرحدی لیجسلیٹو کونسل کیلئے تحصیل مانسہرہ سے واحد نشست کے وہی نمائندے چنے گئے۔ دوسری بار ۱۹۳۶ء میں کامیاب نہ ہو سکے تیسری بار ۱۹۴۶ء میں کامیاب ہوئے قاضی عطاءاللہ جان (مردان) وزیر مال کے اصرار پر پارلیمنٹری سیکرٹری کا عہدہ قبول کر لیا ایک ہزار روپیہ تنخواہ تھی لیکن کام برائے نام تھا کچھ مدت کے بعد اس لئے استعفیٰ دے دیا کہ کام کچھ بھی نہیں اور سرکاری خزانہ سے مفت تنخواہ لینا حرام ہے ہزارہ کے اس جلیل القدر فرزند نے آزادئ وطن کیلئے سب کچھ نثار کیا اور ہر تحریک کے بعد سامراج کے خلاف بڑھ چڑھ کر حصہ لیا طرح طرح کی مصیبتیں برداشت کیں سختیاں جھیلیں۔ اپنی ہٹ سے باز نہ آئے۔ اور عزم و استقلال کے پیکر نے اصولوں کا سودا کبھی نہ کیا۔ بالآخر جنگ آزادی کا یہ سپاہی[۵۱] ۲۱ر فروری ۱۹۶۲ء کو اس دارِ فانی سے رخصت ہوا۔ ان کا ایک فرزند محمد جاوید[۵۲] خان صواتی سیاست کے میدان خارزار میں قدم رکھ چکا ہے۔ پاکستان کی مقتدر شخصیت شاہ دماغ شاہ نشین سیاست دان

حاشیہ صفحہ ۲۲۶

[۵۳] عبدالقیوم خان انوکھا مصنف بھی واقع ہوا کیونکہ عبدالقیوم خان نے "GOLD and GUNS ON THE FRONTIER" کے نام سے ایک کتاب لکھی جو اپریل ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی اس کتاب میں قیوم خان نے مسلم لیگ کو انگریزوں کی پٹھو اور رجعت پسند جماعت قرار دیا تھا۔ یاد رہے یہ وہی کتاب ہے جسے برسر اقتدار آنے کے بعد BAN کر دیا تھا اس لحاظ سے قیوم خان اس ملک کے منفرد مصنف کہلانے کے مستحق تھے جنہوں نے خود ہی اپنی کتاب کو ممنوع قرار دیا۔ (مصنف) (۵۱، ۵۲ صفحہ ۲۲۸ پر)

نواب زادہ نصراللہ خان کا پیروکار ہے اگر اس نے پدری سیاست کو برقرار رکھا تو زمانہ کی گردشیں اس کے راستے میں حائل نہ ہو سکیں گی یہ بے پناہ انقلابی صلاحیتوں کا مالک ہے لازوال شہرت حاصل کرے گا۔ "آفتاب آمد دلیل آفتاب" کے مترادف ہے۔

بہرکیف انتخاب میں صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کو مجموعی طور پر شکست ہوئی اور اس کی وجہ یہ نہیں کہ یہاں کے مسلمان مسلم لیگ کے ساتھ نہیں تھے بلکہ وہ بعض مسلم لیگی لیڈروں کی بے تدبیری کا نتیجہ تھا مگر اس مرحلہ پر بھی باوجود ان لیڈروں کی خود غرضیوں اور کوتاہ اندیشیوں کے اہل ہزارہ نے پھر مسلم لیگ کا ساتھ دیا اور حصول پاکستان کی غرض سے مسلم لیگ کے ایسے امیدواروں کو بھی ووٹ دیا جنہیں وہ دل سے پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ صوبائی اسمبلی کی اڑتیس مسلم نشستوں میں سے سترہ مسلم لیگی امیدوار کامیاب ہوئے ان میں سات پانچ دیگر اضلاع کے تھے اور دس صرف ضلع ہزارہ کے تھے فروری ۱۹۴۷ء میں جب حصول پاکستان کی آخری جنگ شروع ہوئی تو اس کا آغاز بھی ہزارہ سے ہوا چنانچہ سول نافرمانی کی تحریک کا سہرا بھی ہزارہ کے سر رہا۔ اور سچ بات تو یہ ہے۔ کہ اہل ہزارہ نے اس جنگ میں سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ اور اتنے لوگ جیل میں چلے گئے کہ وہاں تل دھرنے کی کوئی جگہ باقی نہ رہی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس موقع پر صوبہ سرحد کے دیگر اضلاع کے مسلمانوں نے بھی اس جدوجہد میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے سرگرم حصہ لیا۔

حاشیہ صفحہ ۲۲۷ سے

۱ جمال قیوم خان صواتی کی تاریخ پیدائش ۱۸۹۲ء ہے آپ نے میٹرک گورنمنٹ ہائی سکول ایبٹ آباد و دیم آئے او نیٹل سکول امرتسر سے ۱۹۱۲ء میں پاس کیا جہاں وہ اپنے بھائی غلام ربانی خان کے پاس رہے وہ کلسیلہ سروس گرداور رقانونگو محکمہ مال تعینات تھے اور ۱۹۳۸ء میں بی اے پاس کیا

۲ محمد جاوید خان صواتی متحدہ جمہوری محاذ ضلع ہزارہ کا صدر رہ چکا ہے۔ تحریک ختم نبوت کے دوران تحریک ختم نبوت کا صدر رہا ہے۔ اور متحدہ محاذ صوبہ سرحد کا نائب صدر ہے اور ملکی سیاست میں منفرد مقام حاصل ہے۔ (مصنف)

جب انتخاب میں مسلم لیگ کو بھاری اکثریت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد سلہٹ اور سرحد میں استصواب رائے کا مرحلہ پیش آیا۔ یہ مرحلہ نئے وطن کی بقاء اور حدود کیلئے انتہائی اہم تھا۔ سلہٹ میں مولانا حسین احمد مدنیؒ کا طوطی بولتا تھا اور سرحد میں کانگریس وزارت کا اثر و نفوذ، کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ ایک طرف جاہ و حشمت کا طوفان اور دوسری طرف...... ایک بار پھر علماء اور مشائخ کرام میدان میں کود پڑے۔ خدا کا سہارا اور اس کے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نام ان کی متاع کل تھی۔ جس میں مقابلہ باسہاروں اور بے سہاروں کے درمیان ہوا۔ اور نتیجتاً بے سہارے جیت گئے۔ حسین احمد مدنیؒ کے سحر زدہ ماحول کو ظفر احمد عثمانی کے عزم و ہمت نے تلپٹ کر دیا۔ اور خان برادران کے غرور و تمکنت کا بت پیر مانکی شریف اور شبیر احمد عثمانی کے جذبہ سے ٹکرایا۔ تو وہ ٹوٹ کر پاش پاش ہو گیا۔ پھر سلہٹ اور سرحد نے اپنی قسمت مملکت اسلامیہ پاکستان سے وابستہ کر دی۔

جب وطن عزیز پر غلامی کے اندھیرے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے چھٹ گئے اور "دیوانوں کا خواب" حقیقت بن کر ابھرا۔ اسلاف کی روایات کا امین سبز ہلالی پرچم جب آزاد فضاؤں میں لہرا دیا تو لہرانے والے ہاتھ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی صبح کو کراچی میں مولانا شبیر احمد عثمانی کے تھے۔ اور اس طرح اس خواب کی تکمیل بھی علماء کے ہی ہاتھوں ہوئی۔ جس کی ابتداء میں بھی ایک عالم دین کا خون جگر شامل ہے۔ ایک افسانہ حقیقت کا روپ دھارنے لگا۔ اور حضرت قائد اعظم محمد علی جناح اس حقیقت کے پہلے سربراہ مقرر ہوئے ؎

کی محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس جنگ آزادی میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ سرحد میں ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت توڑ دی گئی۔ تو سب سے پہلی مسلم لیگی وزارت جو عالم وجود میں آئی۔ اس کے بنانے والے بھی حضرات کے ممبران ہی تھے

کیونکہ مسلم لیگ اسمبلی پارٹی میں انہیں اکثریت حاصل تھی۔

جنگ آزادی کی اس جدو جہد میں اہل ہزارہ کی قربانیوں کے بعد جب تک اس ملک میں سیاستدانوں کا دور رہا انہوں نے یہاں کے مخلص عوام کی ان قربانیوں کی کیا قدر کی؟ وہ یہاں کے لوگوں سے مخفی نہیں ہے۔

اس طویل سیاسی دور میں ہزارہ کو بری طرح نظر انداز کیا گیا وہ اس طرح اقتصادی بد حالی میں مبتلا رہے جس طرح انگریزوں کے زمانے سے چلے آتے تھے۔ مگر ان کے ایمان متزلزل نہ ہوئے وہ اب بھی غربت و افلاس میں مبتلا ہونے کے باوجود پاکستان کے سچے وفادار اور اس کے جانباز سپاہی ہیں۔ اور ان کی خدمات کے پیش نظر تاریخ انہیں ان الفاظ سے یاد کریگی

ع

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مرد کہستانی